نگار

قیمت ۸ر

نرخنامۂ اُجرت اشتہار

	ایک سال	۶ ماہ	۳ ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ	۱۰۰ روپیہ	۵۰ روپیہ	۲۵ روپیہ	۱۰ روپیہ
آدھ صفحہ	۵۰ "	۲۵ "	۱۳ "	۸ روپیہ
چوتھائی صفحہ	۲۵ "	۱۳ "	۷ "	۴ روپیہ

۱۔ اُجرت بہرحال پیشگی لی جائیگی۔ ووچر یا وی۔ پی کے ذریعہ وصولی منظور نہیں

۲۔ جتنی مدت کے لئے اشتہار دیا جانا طے ہوا ہے اُس کی رقم پیشگی یکمشت لی جائے گی۔ ماہانہ ادائی کی صورت میں نرخ وہی ماہانہ رہیگا۔

۳۔ اشتہار فراہم کرنے والی کمپنیوں کا کمیشن ذریعہ خط و کتابت طے ہو سکتا ہے

منیجر "نگار" لکھنؤ

"نگار" کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر..... پانچ روپیہ

ششماہی ہندوستان کے اندر..... تین روپیہ

سالانہ بیرون ہند..... بارہ شلنگ

ششماہی بیرون ہند..... ۷ شلنگ

نوٹ:۔ رسالہ ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک شائع ہو جاتا ہے ۲۵ تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے ورنہ بعد کو آٹھ آنہ فی پرچہ کے حساب سے قیمت لی جائے گی۔

حصول جواب کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہے۔ خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے۔

"منیجر"

تصانیف نیاز فتحپوری

مجموعۂ استفسار و جواب دو جلد

ان دونوں جلدوں میں سنہ ۲۲ء سے لیکر سنہ ۳۰ء تک کے استفسار و جواب شائع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان دونوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسائل شامل ہیں۔

قیمت:۔ جلد اول ۴ے
جلد دوم ۴ے
علاوہ محصول۔

مکتوبات نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شائع ہوئے ہیں نیز وہ جو شائع نہیں ہوئے۔

جذبات نگاری اور سلاست بیان زمینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فنِ انشا میں بالکل پہلی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں معہ تصویر حضرت نیاز ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شائع ہوئی ہے۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول۔

جمالستان

اڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دلکش مجموعہ۔ جس میں ۳۲ء افسانے سنہ ۳۳ء تک کے درج ہیں زبان قدرت بیان اعلیٰ تخیل اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسائل کا حل بھی آپکو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔

قیمت چار روپیہ (للگ)
علاوہ محصول۔

ترغیبات جنسی (یا) شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات اور انکی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ بحث کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی۔ نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپکو حیرت انگیز واقعات نظر آئینگے

قیمت تین روپیہ (رے)
علاوہ محصول۔

نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۵ تاریخ تک شایع ہوجاتا ہے

رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا۔

سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صدر اشٹشاہی تین روپیہ ۸ آنہ)

بیرون ہند سے بارہ شلنگ آٹھ روپیہ (بعہ) سالانہ بیشگی مقرر ہے

جلد (۲۹)	فہرست مضامین مئی ۱۹۳۶ء	شمار (۵)

ملاحظات ——— ۲

کیا مذہب کوئی فطری چیز ہے؟ ——— ۹

اصغر گونڈوی کا جدید مجموعۂ کلام ——— ۱۵

دلوں کی آگ ——— محمد ذوالفقار کیفی منشی فاضل ——— ۲۵

خودکشی ——— ۳۴

تاریخ کا ایک ورق مجہول ——— ۴۲

جاپانِ جدید ——— عبدالرحیم شبلی بی کام ——— ۴۸

باب الاستفسار ——— ۵۵

باب المراسلۃ ——— ۶۱

مکتوبات نیاز ——— ۶۸

منظومات ——— ذوقی ـــ فطرت ـــ نجی احمد ـــ میکش ـــ ماہر القادری ـــ اختر ـــ فضل اثر ——— ۷۱

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۲۹	مئی سنہ ۳۶ء	شمار ۵

ملاحظات

کانگرس اور اشتراکیت (سوشلزم)

امسال کانگرس کا انعقاد لکھنؤ میں ہوا اور چونکہ سال آیندہ ہندوستان میں ایک ایسے جدید دستور کا نفاذ ہونے والا ہے جس کے قبول کرنے پر یہاں کی آبادی راضی نہیں ہے، اس لئے حقیقت یہ ہے کہ بہت اہم تھا، پھر اسی کے ساتھ پنڈت جواہر لال نہرو کا صدارت کے لئے منتخب ہونا ایک اور امر اضافی تھا جس نے کانگرس کو غیر معمولی اہمیت دیدی تھی۔

کانگرس میں صدر کی حیثیت، کابینہ کے وزیر اعظم کی سی ہوا کرتی ہے اور اکثر و بیشتر اسی کی پالیسی اور اسی کی ہدایت پر کامیابی کا انحصار ہوتا ہے۔ پھر چونکہ کانگرس کا صدر اپنی پالیسی کا اعلان ہمیشہ اپنے خطبہ صدارت میں کر دیا کرتا ہے اس لئے دنیا پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارتی تقریر سننے کی بیتابی سے منتظر تھی اور

اس میں شک نہیں کہ اس خطبہ میں وہی سب کچھ تھا جسکو ایک فریق کا تمنا اور دوسرے فریق کے اندیشہ سے تعبیر کرنا ناموزوں نہ ہوگا۔

پنڈت جی نے اپنے ذہن میں ہندوستان کے مستقبل کا جو خاکہ تیار کر رکھا ہے اور جس کے اعلان واظہار میں انھوں نے ہمیشہ غیر معمولی جرأت سے کام لیا ہے، کسی سے مخفی نہیں۔ وہ فطرتاً نہایت آزاد خیال واقع ہوئے ہیں اور جب اس آزادی خیال کے ساتھ کسی ملک کی خود اختیاری کی تمنا کی بات ہو تو اسکے معنے صرف ایک ہی ہوا کرتے ہیں یعنی۔ اشتراکیت و عوامیت کا استیصال اور اشتراکیت (سوشلزم) کی اشاعت

قبل اس کے کہ میں پنڈت جی کی پالیسی پر تبصرہ کروں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اشتراکیت کا مفہوم مختصر الفاظ میں سمجھا دوں۔

اشتراکیت کا لغوی مفہوم یہ ہے کہ متاعِ عالم تمام افرادِ انسانی میں مشترک قرار دیجائے اور وہ سب یکساں طور پر اس سے فایدہ اٹھائیں۔ اس کی دو قسمیں ہیں ایک "اشتراکیت محض" دوسرے "اشتراکیت تعاونی"۔ اول الذکر کا مفہوم ابھی ظاہر کیا جا چکا ہے۔ موخر الذکر سے مراد یہ ہے کہ افرادِ انسانی تقسیم عمل کے ماتحت خدمات انجام دیں اور نفع یا نتیجہ میں سب کا حصہ مساوی ہو۔ اگر کوئی فرد مجبوراً اپنا فرض ادا کرنے سے قاصر ہو تو ہیئت اجتماعی (سوسائٹی) اس کی اعانت کرے۔ الغرض اشتراکیت کا مقصد یہ ہے کہ سرمایہ داری اور جماعت حاکمہ کے درمیان جو عدم توازن پایا جاتا ہے اس کو مٹا دیا جائے اور جبر کی بجائے ایسا نظام حکومت قایم کیا جائے جس میں تمام افرادِ انسانی مساوی حیثیت رکھیں اور جملہ دولت کو قومی کاسبہ قرار دیکر مزدوروں کے حقوق مساوات کو پامال نہ کیا جائے۔ یہی وہ نصب العین ہے جس کے ماتحت اشتراکیین عالم کے موجودہ نظام حکومت کو الٹ دینا چاہتے ہیں۔

اشتراکیت کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کا وجود اسی وقت سے پایا جاتا ہے جب سے دنیا میں ملوکیت کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ یونان قدیم میں والیاس نے جو قانون مرتب کیا وہ اسی اصول کا حامی تھا۔ افلاطون نے یونانی جمہوریت کو قایم کیا تو اشتراکیت کو پیش نظر رکھ کر جس میں زمین، عورت اور غلام کو مشترک ملکیت قرار دیا گیا تھا۔

دوسری صدی قبل مسیح میں بحر مردہ کے ساحل پر بسنے والی جماعت جو فرقۂ اسینی (Essenes) کے نام سے موسوم تھی اصول اشتراکیت پر عامل تھی۔ دوسری صدی عیسوی میں ایک گروہ آڈمیٹا کے نام سے نمودار ہوا اور یہ بھی اشتراک و مساوات پر عامل تھا۔ بالینڈ میں متعدد جماعتیں اشتراکی اصول پر قایم ہوئیں جن میں سب سے زیادہ مشہور وہ تھی جسے ۱۳۵۰ء میں جرارگروٹ نے قائم کیا تھا۔

عہد وسطیٰ کے جرمنی میں جو خونریز جنگ زمینداروں اور کاشتکاروں کے درمیان ہوئی وہ بھی اشتراکیت کا نتیجہ تھی۔ اس کے بعد اٹھارویں صدی میں فرانس کے اندر سان سیمون، شارل دوریا اور پرودُن نے اسی کی تبلیغ کی۔ انگلستان میں رابرٹ اوین نے اشتراکی خیالات کی اشاعت شروع کی اور جرمنی کا کارل مارکس اس کا جو تازہ بردست علمبردار تھا وہ تو سبھی کو معلوم ہے۔ اور زمانہ حال میں سوویٹ حکومت اسکا زندہ نمونہ سو جو دہی ہے۔ الغرض اشتراکیت کوئی نئی چیز نہیں ہے جس کا نام سنکر لوگ گھبرا اٹھیں، اسوقت بھی شاید ہی کوئی ملک ایسا ہو جہاں اشتراکی جماعتیں نہ پائی جاتی ہوں اور اُن کی بے چینی سے حکومت متاثر نہ ہوتی ہو چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہندوستان میں بھی ایک اچھی خاصی جماعت اس خیال کی پیدا ہوگئی ہے جس کے ایک سربرآوردہ رکن پنڈت جواہر لال نہرو بھی ہیں۔

کسی گزشتہ ماہ کے نگار میں کانگرس پر اظہار خیال کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا کہ پنڈت جی چونکہ اشتراکی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے ان کا پروگرام بھی ویسا ہی ہوگا اور ممکن ہے کہ وہ ایک جماعت اپنی ہمخیال پیدا کرکے کانگرس میں اکثریت حاصل کرلیں۔ لیکن اس پیشین گوئی کا ایک حصہ صحیح نکلا اور دوسرا غلط۔ یعنی ان کا خطبۂ صدارت تو بیشک اشتراکیت سے لبریز تھا۔ لیکن کانگرس میں وہ اشتراکی پروگرام کو کامیاب نہ بنا سکے۔

پنڈت جی کے خطبۂ صدارت کے مرور الوقت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حکومت کے موجودہ سرمایہ دارانہ اصول اور اس کی استعمارانہ ملوکیت کے سخت مخالف ہیں، اور ان کا نصب العین تقریباً وہی ہے جو سوویٹ حکومت کے پیش نظر ہے یعنی وہ ہندوستان کو انگلستان سے بالکل علحدہ کرکے بالکل آزاد دیکھنا چاہتے ہیں اور ایسی قومی حکومت کے متمنی ہیں جو اعلیٰ طبقہ کو گرا کر ادنیٰ طبقہ کو ابھار کر تمام آبادی کو توسط طبقہ کے معیار پر لے آئے۔ بہرقطع نظر اس سے کہ یہ تحریک ہندوستان کے لئے مفید ہے یا مضرت رساں ہر محل ہے یا قبل از وقت، غور طلب امر صرف یہ ہے کہ آیا اس آرزو کی تکمیل یہاں ممکن بھی ہے یا نہیں۔ میرا فیصلہ یہ ہے کہ "ممکن نہیں ہے" اور اسی حقیقت کے اظہار کے لئے میں نے اس مسئلہ کو چھیڑا ہے۔

دنیا میں علاوہ اشتراکیت کے اور بھی چند ذرا ذرا سی چیزیں حکومت کے لئے موجود ہیں جنھیں فوضویت (Nihilism) مشائیہ (Communism) اور لامیت (Anarchism) کے نام سے پکارا جاتا ہے اور یہ سب ایک ہی جذبہ کے مختلف مظاہر ہیں، لیکن سوائے اس کے کہ کبھی کبھی اور کہیں کہیں ان تحریکوں نے وقتی ہنگامہ تو ضرور پیدا کر دیا، کوئی پائیدار کامیابی حاصل نہیں کی۔ اس لئے ان لوگوں کو جو اس خیال کے حامی ہیں سب سے پہلے اس امر پر غور کرنا چاہئے کہ اس ناکامی کا کیا سبب تھا

اور کیا وہ موانع جو اس سے قبل ان تحریکوں کی کامیابی میں حایل ہوئے ہیں، ایسا کبھی دور ہو سکتے ہیں۔

اشتراکیت کا مفہوم و مدعا اس سے قبل بیان کیا جا چکا ہے، کمیونزم بھی بالکل وہی چیز ہے، انارکزم کو اس تحریک کی دوسری منزل سمجھئے جب حکومت سے کھلا بغاوت اختیار کی جائے اور نہلزم تیسری منزل جب حکومت کا کوئی وجود ہی سرے سے باقی نہ رہے۔ اس میں کلام نہیں کہ ان تمام منازل کو طے کرنے کا اصل مقصود تک پہنچنے میں تصادم و تخاصم، ہنگامہ و فساد، قتل و خونریزی ضروری ہے، لیکن چونکہ نفس مدعا دنیا میں حقیقی مساوات پیدا کرنا اور سوسائٹی سے ادنیٰ و اعلیٰ کی تمیز کو اٹھا دینا ہے، اس لئے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک کا نا کامیاب رہنا سخت ظلم ہے اور اگر آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں ضرور اس کو کامیابی حاصل ہوگی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ شاید فطرت کو خود یہ منظور نہیں ہے کہ دنیا میں کبھی وہ مساوات پیدا ہو سکے جو اشتراکیین کے پیش نظر ہے اور انسان کی ذہنی افتاد اور اسکی دماغی ساخت ہی سے امتیاز ادنیٰ و اعلیٰ کے مٹا دینے پر اسی بڑی مشکل

ایک انسان کی کوشش تبھی اس صورت میں بار آور ہو سکتی ہیں کہ وہ قانون قدرت کے ساتھ ساتھ چلے، چنانچہ عہد حاضر کے تمام ایجادات و اختراعات صرف نوامیس فطرت کے سمجھنے کے بعد ہی عالم ظہور میں آئے ہیں اور ان میں سے کوئی ایک ایجاد بھی ایسی نہیں ہے جو قانون فطرت سے روگردانی کرنے کے بعد حاصل ہوئی ہو۔ اس لئے قبل اس کے کہ ہم اشتراکیت کی کامیابی کا خواب دیکھیں خود فطرت انسانی پر غور کر لینا ضروری ہے۔ کائنات کا نظام جس اضداد کے ظہور و تصادم پر قائم ہے، رات دن سیاہ و سفید، قوی و ضعیف، ادنیٰ و اعلیٰ، موت و حیات یہ وہ تمام مناظر و مظاہر ہیں جن سے دنیا کی ترتیب ہوئی ہے اور انھیں مختلف قوتوں کے تصادم پر ہنگامۂ زیست بلکہ دنیا کی رونق قائم ہے۔ قوی و ضعیف کی باہمی جنگ نباتات، حیوانات بلکہ تمام عالم حیات میں جاری ہے اور حقیقتاً زندگی کا عبارت اسی فتح و شکست پر اس لئے کوئی کوشش اس فطری اقتضاء منافست کو مٹا دینے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ انسان اگر عبارت ہے قوت عقل و شعور سے تو اس کے افراد میں عدم مساوات کا ہونا ظاہر ہے، اور ایک عقلمند کا بیوقوف کی حماقتوں سے فایدہ اٹھانا یقینی۔ انسان خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے اس کی خودغرضی، نفس پرستی، اور غلبہ و انتقام کی خواہش کبھی محو نہیں ہو سکتی اور اسی جذبۂ تفوق و برتری کی بدولت دنیا نے اتنی ترقی کی ہے۔ اس لئے اصولاً کوئی وجہ نہیں کہ اشتراکیت اپنے صحیح معنوں میں کبھی وقت کامیاب ہو سکے لیکن اگر اس سے مراد کوئی ایسی آئینی حکومت ہے جو افراد کے باہمی فرق و امتیاز کو علی حالہ قائم رکھتے ہوئے، دولت و سرمایہ داری کی طمع کو اس حد تک مٹا دے کہ مزدوروں کے جایز حقوق پامال نہ ہونے

پائیں اور ایک انسان صرف اس لئے بھوکا نہ مرے کہ اس کے لئے دنیا میں کوئی کام نہیں ہے۔ یقیناً نہایت مبارک خیال ہے اور دنیا کا ہر وہ شخص جو درد و دکھ سے متاثر ہونے والا دل رکھتا ہے اس کی تائید کرے گا۔ حکومت برطانیہ تو خیر پارلیمنٹری حکومت ہے جس میں پبلک کی آواز کو کافی درخور حاصل ہے، اگر آپ دنیا کی کسی مستبد ترین شخصی حکومت سے سوال کریں گے تو وہ بھی اپنا نصب العین یہی ظاہر کرے گی لیکن سوال یہ ہے کہ اس کی ذمہ داری زیادہ تر کس پر عاید ہوتی ہے۔ پبلک پر یا حکومت پر؟ یعنی اگر حکومت کوئی ایسا دستور مرتب کرے بھی تو کیا وہ مفید ہو سکتا ہے اگر خود ملک کی آبادی اس احساس مساوات کے ساتھ اس پر عمل کرنے کے لئے تیار نہ ہو۔

آپ دنیا کے بہتر سے بہتر دستور کو لے لیجئے لیکن وہ کبھی مفید نہیں ہو سکتا اگر اس پر عمل کرنے کے لئے خود ملک کی آبادی میں کامل اتحاد و تعاون کا جذبہ موجود نہ ہو۔ کیونکہ بہرحال حکومت کے ہاتھ پاؤں ملک ہی کے افراد ہوا کرتے ہیں اور جب انھیں میں احساس مساوات نہ ہوگا تو دستور و آئین کیا کرے گا اور ملک و قوم کو اس سے کیا فایدہ پہونچ سکتا ہے۔

اشتراکیت کی ناکامی کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ مستبد حکومتوں نے ہمیشہ اسے بزور شمشیر مغلوب کیا لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل سبب وہ ذہنی اختلاف تھا جو ملک کی جماعتوں میں پایا جاتا تھا اور اگر آج ہندوستان میں کوئی وجہ اس کی ناکامی کی ہو سکتی ہے تو صرف یہی۔ بلکہ یہاں تو اس کی عدم کامیابی کے اور زیادہ قوی اسباب موجود ہیں، کیونکہ اول تو یہاں کی آبادی زیادہ ہے کہ اس کو یا اس کی اکثریت کو کسی ایک مرکز پر جمع کرنا یونہی سخت دشوار ہے چہ جائیکہ اسوقت جبکہ ذہنی و معاشرتی اختلافات کی بنا پر سیکڑوں کیا ہزاروں جماعتیں ملک کے اندر بنائی جاتی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ اشتراکیت خالص اقتصادی تحریک ہے اور جس حد تک معاشی دشواریوں کا تعلق ہے ہندوستان کی اکثر آبادی کو اس پر متفق ہو جانا چاہئے لیکن اس کا کیا علاج کہ معاشیات سے کہیں زیادہ یہاں روایتی تہذیب و زندگی کو اہمیت دیجاتی ہے اور یہ اختلاف اتنا زبردست ہے کہ اس کے دور ہونے کی بظاہر کوئی توقع نہیں ہو سکتی۔ مغرب میں اشتراکیت کی مخالفت کرنے والے وہی ہیں جو صرف سرمایہ دارانہ ذہنیت رکھتے ہیں ورنہ یوں معاشرت و تہذیب، ذہنی میلان و عواطف کے لحاظ سے وہ سب ایک ہیں۔ لیکن برخلاف اس کے ہندوستان میں ایک سے زاید مخالف قوتیں اشتراکیت کی راہ میں حایل ہیں۔ اگر یہاں سوال صرف سرمایہ داری کا ہوتا تو توقع کی جا سکتی تھی کہ شاید کسی وقت اسکو مجبور کیا جا سکے، اگر سوال صرف اقتصادی دشواری کا ہوتا تو بھی ممکن تھا کہ تمام افراد ایک دوسرے سے

متحد ہونے پر کسی وقت مجبور ہو جائیں لیکن اس کا کیا علاج کہ یہاں کے انسان کو فاقہ کرنا منظور ہے، غلام رہکر جینا گوارا ہے، لیکن وہ یہ کبھی نہیں دیکھ سکتا کہ بنارس کے گئو گھاٹ پر ایک ہی وقت میں اذان بھی ہو رہی ہو اور ناقوس بھی بج رہا ہو۔

یہ ہیں ملک کی آبادی، اس درجہ ذلیل ذہنیت رکھتی ہو، جس کی زندگی عبارت ہو صرف روایات کی پرستش سے، جس نے حیات کا مقصود صرف پوجا پاٹ یا طاعت و عبادت قرار دے رکھا ہو، جو اپنے تمام اعمال و افعال کے نتائج کو حیات بعد الموت پر اٹھا رکھے، جہاں انسانیت کا معیار انسان ہونا نہیں بلکہ مسلمان یا کافر ہونا ہو، جو ایک گائے کے لئے انسان کا خون بہا دینا جائز سمجھتی ہو، جو ناقوس بجانے کے جرم میں انسانوں کے گلے چھری سے کاٹ دینے میں تامل نہ کرے اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اشتراکیت کے اصول کو قبول کر سکتی ہے، حد درجہ غیر دانشمندانہ فیصلہ ہے۔ اصل چیز جو تمدنی و عمرانی نظام کو وسیع و پر امن بنانے والی ہے وہ انفرادی و اجتماعی طور پر قلب و ضمیر کی صفائی ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب تمام آبادی کسی ایک مذہب کو اختیار کرے یا پھر یہ کہ سرے سے مذہب ہی کو فنا کر دیا جائے۔ اس لئے اگر پنڈت جواہر لال نہرو ان دونوں میں سے کسی ایک صورت کو کامیاب بنانے پر قادر نہیں ہیں، تو اشتراکیت کا پرچار بھی کوئی معنی نہیں رکھتا اور اپنا سر کھپانا ایک بیکار شغل ہے۔ جو شخص بھی ذہن و قوت عمل رکھنے والے انسان کو کبھی راضی نہ ہونا چاہئے۔ [illegible] جواہر لال نہرو اصول اشتراکیت کو کامیاب بنانے کیلئے دستور جدید کے رد کر دینے اور افراد حکومت سے لڑ جانے کا درس دے رہے تھے، ابھی لکھنؤ کا ایک معزز فرد بمبئی میں مسلم لیگ کی کرسی صدارت پر بیٹھا ہوا یہ کہہ رہا تھا کہ ہمیں دستور جدید کی پذیرائی نہایت خوشدلی سے کرنا چاہئے اور حکومت سے مل کر جو کچھ حاصل کر سکتے ہوں اٹھا رکھنے نہ دینا چاہئے ——— اور ہو کانگرس کے خطبہ صدارت کی آواز (جو اشتراکیت یا بالفاظ دیگر کامل اتحاد و مساوات کی آواز ہے) ہنوز فضا میں گونج اور ادھر یونا کے ہندو مسلمان آپس ہی میں لڑ کر سیکڑوں کی تعداد میں ہلاک و مجروح نظر آ رہے تھے۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہ کیا تماشہ ہے، یہ کس نوع کا کھیل ہے، یہ کسی سیاسی رہنمائی ہے اور وہ کون ہے جو اس تاریک مذہبی ذہنیت کے ماحول میں آزادی و اتحاد کی مشعل روشن کرنے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے خطبہ صدارت میں بار بار اس امر پر زور دیا ہے کہ ہم کو چھوٹے چھوٹے کاموں میں پڑ کر بڑے کاموں کو پس پشت نہ ڈال دینا چاہئے، انھوں نے چھوٹے کاموں کی فہرست میں فرقہ وارانہ اختلاف کو رکھا ہے اور بڑے کاموں میں دستور جدید کو کامیاب بنانے کو، حالانکہ اس وقت سب سے زیادہ اہم اور سب سے بڑا کام اگر کوئی ہو سکتا ہے تو صرف یہی کہ فرقہ بندی کے جذبات کو محو کیا جائے اور آئے دن کی لڑائیاں ہندو مسلمانوں کی ختم ہو جائیں اگر اس میں کامیابی حاصل ہو جائے تو دستور جدید کو ناکامیاب بنانے کا بڑا کام نہایت معمولی کام رہ جاتا ہے۔ دستور جدید کے

وضع کرنے والے یقیناً اس حقیقت سے واقف تھے کہ ہندوستان جو مذہبیت کی بلا میں گرفتار ہے کبھی کوئی متفقہ محاذ پیدا نہیں کرسکتا اور اس لئے وہ جو دستور بھی بنائیں گے اسکو بزور بہ دشت نافذ بھی کیا جاسکتا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ خود ہمارے ہندوستان کے رہنے والے قائد و رہنما ابتک اس سے بیخبر ہیں کہ آزادی کی راہ میں جو چیز حایل ہے وہ نہ برطانیہ کی مستعمرانہ پالیسی ہے، نہ اسکی مستبدانہ حکومت، بلکہ وہ ہمارا جہل ہے، ہماری قدامت پرستی ہے، ہماری روایتی زندگی کی بندشیں ہیں، ہمارے مذہبی معتقدات کی زنجیریں ہیں، اور ہمارا یہ یقین کہ فلاں ملچھ ہے اور فلاں کافر۔

ہندو مسلمانوں کی زندگی کے جس پہلو پر نگاہ ڈالئے اس سے اختلاف و تضاد ٹپکتا ہے۔ ان کی وضع و قطع، ان کا لباس، ان کی رفتار و گفتار، ان کی غذا، ان کی معاشرت، ان کا ذوق، ان کی زبان غرضکہ زندگی کی ہر ہر چیز میں ایک دوسرے سے اختلاف پایا جاتا ہے اور اختلاف بھی اتنا شدید کہ اس سے نفرت و استکراہ کی کیفیت پیدا ہے۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جواہر لال نہرو کس دل سے اس مسئلہ کو غیر اہم قرار دیتے ہیں اور اس کو حل کئے بغیر ان کو آگے قدم بڑھانے کی جرأت کیونکر ہوسکتی ہے۔ یقیناً اس میں کوئی راز پنہاں ہے اور مجھے یہ کہنے میں تامل نہ کرنا چاہیے کہ یہ راز سوائے اسکے اور کوئی نہیں کہ ہندو قوم اب مسلمانوں سے بے نیاز ہوکر منزل تک پہنچنا چاہتی ہے اور اس نے فیصلہ کرلیا ہے کہ اگر مسلمان اس کی راہ میں حایل ہوئے بھی تو وہ ان کو پامال کرکے گزر جائے گی ــــ "ہندوستان! ہندو راج! ہندو معاشرت! ہندو زبان!" یہ ہے ان تمام ہندو نعروں کا ماحصل جو کانگرس اور تمام ہندو جماعتوں کے جد و جہد کی بنیاد قایم ہے۔ ہندو جانتے ہیں اور یہ جاننا ان کا غلط نہیں ہے کہ ملک میں ان کی اکثریت ہے (اور اگر مہاتما گاندھی کی تحریک چھوت ادھار کی کامیاب ہوگئی تو اس اکثریت کی قوت کا اور زیادہ بڑھنا لازم ہے) اسی کے ساتھ وہ اس راز سے بھی آگاہ ہیں کہ برطانوی حکومت ہمیشہ اکثریت کے ساتھ چنانچہ یہ کیا کرتی ہے اس لئے اگر ان میں ہندو راج قائم کرنے کا جذبہ پایا جائے تو بے محل نہیں ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر کوئی حکومت ایسی قایم ہو بھی گئی تو کیا وہ حقیقی معنی میں ملک و وطن کی آزاد حکومت ہوگی اور کیا مسلمانوں کی آٹھ نو کروڑ کی آبادی کوئی ایسی معمولی چیز ہے جسکو نظر انداز کرنے کے بعد وہ غیر ملکی عناصر سے ملک کو بالکل پاک کرسکیں گے۔ پھر ہوسکتا ہے کہ ہندو نظام حکومت پر قبضہ کرکے مسلمانوں کو ملازمتوں سے محروم کردیں، یہ بھی ممکن ہے کہ ہندو مسلمانوں کو اس سے زیادہ اقتصادی دشواریوں میں مبتلا کردیں لیکن اس چیز کا نام ملک و وطن کی آزادی ہو وہ اسوقت تک کبھی حاصل نہیں ہوسکتی جبتک یہاں دو کا جھگڑا مٹنے کے لئے تیسرے کو فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے۔

میرا سفر گورکھپور قصد ہے کہ مئی کے پہلے ہفتہ میں لکھنؤ کے جہنم زار کو چھوڑ کر چند دن کہیں اور بسر کروں جانے سے پہلے ڈیرہ اسماعیل خاں میں اپنے عزیز دوست جناب اخوند فیض محمد صاحب فاروقی کے پاس قیام کا ارادہ کر رہا ہوں وہاں سے نیراں شاہ (وزیرستان) اپنے مخلص کرمفرما خان بہادر سردار محمد نواز خاں صاحب اسسٹنٹ پولیٹکل ایجنٹ کے پاس جاؤں گا اور انھیں کی معیت میں بنوں اور کوہاٹ وغیرہ ہوتا ہوا چند دن رزمک میں رہوں گا جو بقول اخوند صاحب کے اپنے موسم کے لحاظ سے شملہ اور روتق کے لحاظ سے مختصر سا کلکتہ ہے۔ امید ہے کہ اس دوران میں برشگالی ہوائیں چلنے لگیں گی اور جس وقت لکھنؤ واپس آؤں گا تو بادِ سموم کے جھونکے (جنھیں میں نظمہائے یاس انگیز کہتا ہوں) ختم ہوچکے ہوں گے جو احباب اس زمانہ میں مجھ سے خطاب کرنا چاہیں وہ دفتر نگار ہی کے پتہ سے خط و کتابت فرمائیں۔ کیونکہ یہاں سے میرے نام کی ڈاک روزانہ ہوتی رہے گی۔ علاوہ اس کے ممکن ہے کہ آخر وقت میں کچھ اسباب ایسے پیدا ہوجائیں کہ میں یہ سفر اختیار ہی نہ کرسکوں۔

کیا مذہب کوئی فطری چیز ہے؟

ایک زمانہ اس عاقل و ذیہوش انسان پر ایسا بھی گزرا ہے جب مذہب سے انکار تو خیر بڑی چیز ہے اسکی حقیقت پر غور کرنا بھی معصیت خیال کیا جاتا تھا اور اس قسم کی بحث گویا توہین خداوندی کے مترادف تھی چنانچہ انیسویں صدی کے وسط تک اس مذہبی گرفت اور ذہنی غلامی کا یہ عالم تھا کہ کائنات کو انسان نے خدا اور شیطان کے درمیان تقسیم کر رکھا تھا یعنی تمام اچھی باتیں خدا سے منسوب کی جاتی تھیں اور بری باتیں شیطان سے۔ گویا انسان ایک نہایت ہی ذلیل قسم کا گدا تھا جو خود نہ کوئی بات کر سکتا تھا اور نہ وہ کسی امر کا ذمہ دار قرار پا سکتا تھا۔

لیکن اب کہ دنیا کی ہر چیز ہر کیفیت پر علمی و تحقیقی نقطۂ نظر سے بحث کی جاتی ہے اور ایک ایک ذرہ سے لیکر پہاڑوں کی سر بفلک چٹانوں تک کوئی چیز ایسی نہیں جو مطالعہ علم و تحقیق سے باہر ہو، مذہب کا بچنا دشوار تھا اور کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ علم کی دراز دستی سے محفوظ رہ سکتا۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ علم یا سائنس کا تعلق صرف مادی چیزوں سے ہے اور مذہب چونکہ روحانی چیز ہے اس لئے سائنس کی رسائی وہاں ممکن نہیں۔ لیکن یہ غلط ہے کیونکہ سائنس کا تعلق جس طرح مادی چیزوں سے ہے اسی طرح غیر مادی اشیاء سے بھی ہے۔ اگر وہ کمیت سے بحث کرتا ہے تو کیفیت بھی اس کی دسترس سے باہر نہیں۔ چنانچہ نفسیات جس کا تعلق نفس ہے، وجدانیات یا جمالیات جس کا تعلق حسن و جمال سے ہے، اخلاقیات جو انسان کے اخلاق سے متعلق ہے اور اسی طرح کے دیگر علوم سب غیر مادی چیزوں سے بحث کرتے ہیں۔

سائنس فی الحقیقت نام ہے ایک صحیح اور بے لاگ انتقادی مطالعہ کا خواہ اس کا موضوع کوئی مادی چیز ہو یا غیر مادی اور اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ مذہب جو ہزاروں سال سے انسانی رجحانات پر حکمرانی کرتا چلا آرہا ہے محض اس لئے کہ اس کا تعلق روح و روحانیات سے ظاہر کیا جاتا ہے، تحقیق علمی کے حدود سے باہر رکھا جائے۔ چنانچہ آج کی صحبت میں ہم اس موضوع پر خالص علمی نقطۂ نظر سے غور کر کے دیکھیں گے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور وہ انسانیت کیلئے ضروری ہے یا نہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ مسئلہ غور طلب ہے کہ آیا مذہب واقعی کوئی الہامی چیز ہے یعنی کیا خدا کی طرف سے اس کی پابندی انسان پر عاید کی گئی ہے۔ اور اس کے بعد یہ کہ اگر الہامی نہیں ہے تو اس کے وجود کے اسباب کیا تھے۔

اگر ہم اس کو تسلیم کر لیں کہ مذہب کا مقصود نوع انسان کی فلاح و بہبود ہے تو ہمکو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ خدا نے انسان کی آفرینش کے ساتھ ہی ساتھ مذہب بھی الہام کیا ہوگا ورنہ اس کے یہ معنے ہوں گے کہ خدا نے اول اول تو ہدایت کو ضروری خیال نہ کیا تھا لیکن بعد کو اس کی ضرورت اس نے محسوس کی یقیناً شان خداوندی کے منافی ہے۔ اگر خدا کا مقصود انسان کی آفرینش سے کوئی بے معنی کھیل نہ تھا تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اولین عہد کے انسان کی پروا نہ کرتا اور زمانۂ مابعد کے انسانوں کو قابل توجہ سمجھتا جبکہ آخر الذکر انسان کو حقیقتاً زیادہ تنبیہ و ہدایت کی ضرورت تھی۔ لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ عہد مابعد کے تمام ترقی یافتہ مذاہب جن میں اسلام اور عیسویت کو زیادہ نمایاں درجہ حاصل ہے ہمارے اپنے ہی کو الہامی مذہب قرار دیتے ہیں اور قرون ماضیہ کو عہد تاریکی، دور جاہلیت، زمانۂ دخت دور بربریت کے الفاظ سے یاد کرکے گویا ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اس زمانہ کے لوگ بالکل گمراہ تھے اور وہ کسی مذہب کے پابند نہ تھے۔ پھر اس اختلاف کا جواب خدا سے لیجئے۔ ایک طویل زمانہ تک انسان کو گمراہ رکھا اور کیوں نہ آن میں کوئی نبی یا پیغمبر بھیجا جو راہ مستقیم سے آشنا کرتا۔ ہم یہ باور نہیں کرتے بلکہ انہیں جماعتوں پر عیاں ہوتا ہے جو اپنے آپ کو الہامی مذاہب کا پابند بتلاتی ہیں۔

وہ حضرات جو آثار قدیمہ سے دلچسپی رکھتے ہیں انہیں معلوم ہوگا کہ انسان کے عہد تحجری کی جو چیزیں (لاکھوں سال قبل کی) اس وقت تک زمین سے برآمد ہوئی ہیں وہ دو تین ہیں صرف چند مخصوص آلات و اوزار پتھر اور ان کے علاوہ کوئی اور چیز ایسی دستیاب نہیں ہوئی جس سے یہ پتہ چلتا کہ وہ خدا یا مذہب کے وجود کا بھی قائل تھا۔ البتہ اب سے ۲۰ ہزار سال قبل کی چیزوں میں ہڈی، ہاتھی دانت یا پتھر کے ایسے نقوش یا بت دریافت ہوئے ہیں جن کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے وہ مذہبی خیالات کے زیر اثر بنائے گئے ہوں۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انسان کے وجود کے ساتھ مذہب کا وجود ظہور میں نہیں آیا اور اس لئے یہ دعوے کرنا کہ مذہب کا خیال بالکل فطری چیز ہے یا یہ کہ اس کا تعلق الہام خداوندی سے ہے کوئی معنی نہیں رکھتا۔

علوم جدید کے مسائل میں مذہب کو سب سے زیادہ نقصان جس مسئلہ نے پہونچایا ہے وہ مسئلۂ ارتقا ہے کیونکہ اس نے ثابت کر دیا ہے کہ ہر چیز خواہ وہ مادہ سے متعلق ہو یا نفس سے ماحول کے زیر اثر تدریجاً آگے بڑھتی ہے اور پھر چونکہ مذہب کا خیال خدا یا پوشش کی طرح فطری مجبوری کا نتیجہ نہ تھا اس لئے ظاہر ہے کہ اس کا وجود اسباب معیشت و ماحول کے زیر اثر ظہور میں آیا ہوگا، اور ایک قوم پر جو زمانہ جس حال میں بسر ہوا ہوگا اسی کے ماتحت اس کے مذہبی خیال میں بھی تبدیلی پیدا ہوتی ہوگی۔ قیام مذہب کی بنیاد وجود خدا کے عقیدہ پر قایم ہے اور خدا کا تصور جس جس طرح مختلف اوقات میں انسان نے کیا ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو انسان کا خالق کہنا شاید اتنا موزوں نہیں ہے جتنا انسان کو خدا کا خالق کہنا۔

علم الانسان اور تاریخ مذہب کے ماہرین اس باب میں مختلف الخیال ہیں کہ خدا کا وجود ذہن انسانی میں کب سے پہلے کب اور کیونکر آیا۔ بعض کا خیال ہے کہ اس کی ابتدا تو اور فطرت یا فطری اشیاء کے مشاہدے سے ہوئی ہے یعنی آسمان و زمین میں جو چیز یا جو قوت انسان کو غیر معمولی نظر آئی اسی کو وہ پوجنے لگا، چنانچہ درخت، پہاڑ، ستارے، چاند سورج وغیرہ مختلف مظاہر فطرت کو انسان نے خدا سمجھا اور ان کی پرستش شروع کر دی۔ بعض کے نزدیک اس کا تعلق قبائل کے سرداروں اور اسلاف کی پوجا سے ہے۔ یعنی قبائل کے جو لوگوں سے کارہائے نمایاں انجام دیئے اور آباؤ اجداد میں سے جو زیادہ مرتبے اختیار کر گئے تھے ان کی پوجا کرنے لگے۔

قدیم روما و یونان میں بھی ایک جماعت مشککین و قائلین ارتقاء کی پائی جاتی تھی اور انھوں نے بھی قیاس آرائیوں سے کام لیکر عقیدۂ خدا کے متعلق مختلف نظریے قائم کئے تھے، چنانچہ انھیں میں سے ایک شاعر لکریٹس کہتا ہے کہ:۔

"سب سے پہلے جس چیز نے زمین پر خدا کو پیدا کیا وہ انسان کا وہ خوف تھا جو اس کو بجلی کی کڑک، طوفان، زلزلے، سمندروں کے تلاطم، آتش فشاں پہاڑوں کے خوفناک مناظر وغیرہ سے ہوا تھا یہ وہ چیزیں تھیں جن سے ڈر کر انسان کو خیال پیدا ہوا کہ اس سے بڑھکر کوئی اور قوت بھی موجود ہے۔"

ہربرٹ اسپنسر کا نظریہ ہے کہ "انسان اول اول جب تک کہ اس کا ذہن [illegible] بھی قائم رہتا ہے۔ اس لئے اگر کوئی سردار مر گیا ہے تو اس کا ہمزاد خیال [illegible] ذہن میں آیا۔ الغرض خدا یا دیوتاؤں کا وجود انسان کا پیدا کیا ہوا ہے جس کی [illegible] کے لحاظ سے مختلف شکلوں اور رنگوں میں پیش کیا۔ چنانچہ اسپنسر کہتا ہے کہ اگر خدا کو [illegible] شکل کا تصور کرتا۔ اس امر کا ثبوت کہ خدا کے تصور میں خود انسان کا ذوق کس [illegible] دیوتاؤں اور بتوں کے دیکھنے سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے۔

حبشیوں کے دیوتا کا رنگ کالا ہوتا ہے اور ناک چپٹی، زنگی کا دیوتا کالا اور [illegible] رکھتا ہے اور شرخ بال۔ اور ہوٹنٹاٹ کا خدا تمام روئے زمین سے بھدا [illegible] ارتقائی درجہ کا خدا دیکھنا ہو تو عہد عتیق کے خدا [illegible] میں پیدا کیا اور پھر تھک کر آرام کرنے پر مجبور ہوا۔ آدمیوں ہی کی طرح اس کے ہاتھ پاؤں ہیں اور انسان ہی کی طرح وہ جذبات سے متاثر بھی ہوتا ہے۔ اس نے آدم کے لئے جانوروں میں سے رفیق زندگی پیدا کیا۔ آدم و حوا کے لئے کھال کا ملبوس طیار کیا، برج بابل دیکھنے کے لئے وہ خود زمین پر اتر آیا، وہ ظالم و خونخوار ہے، رشک و حسد کرتا ہے انسانی قربانیاں چاہتا ہے اور اپنے کئے پر پچھتاتا بھی ہے۔

الغرض خدا کا مفہوم ہمیشہ انسانی حالات کے ماتحت بدلتا رہا ہے۔ اسپنسر کے دور میں اگر وہ ایک

بادشاہ ہے تو عہد جمہوریت میں اس کی حیثیت ایک پریسیڈنٹ سے زیادہ نہیں رہ سکتی۔ ترقی سائنس سے قبل وہ محیر العقول معجزے بھی دکھاتا تھا لیکن اب ترقی علوم کے زمانہ میں وہ بالکل قانون فطرت کا پابند ہے۔

بعض اسے مہربان، محبت کرنے والے باپ کی طرح سمجھتے ہیں، بعض کے نزدیک وہ ایسا ظالم ہے کہ غیر بپتسمہ شدہ بچوں کو دوزخ میں ڈالدیتا ہے اور منکرین کو خواہ وہ کتنے ہی اچھے اخلاق کے کیوں نہ ہوں ہمیشہ آتش جہنم کے عذاب میں مبتلا رکھے گا۔ پھر اس "خدا تراشی" کے ساتھ ہی جب ہم اس کے نتائج کو دیکھتے ہیں تو اور زیادہ حیرت ہوتی ہے کہ انسانیت کیونکر اتنے عرصہ تک اسے برداشت کر سکی۔ بے زبان جانوروں کی قربانیوں کے علاوہ انسانی بچوں اور عورتوں کا ذبح کیا جانا، سحر و جادو کے الزام میں ہزاروں ضعیف عورتوں کو آگ میں ڈالدینا، منکرین کو بیدردی سے تہ تیغ کر دینا یہ تمام وہ مظالم تھے جو مذہب کے پردہ میں روا رکھے گئے کیونکہ جن لوگوں نے خدا کے تصور کو دنیا کے سامنے پیش کیا ان کے دل کمیں نفرت و تعصب سے لبریز تھے اور خدا کا مفہوم ہی وہ اس طرح پیش کرتے تھے کہ انھیں اپنے جذبات پورا کرنے کا موقع ملے۔ حقیقت یہ ہے کہ دیوتاؤں کا وجود خود انسان کے احساس و ضروریات کی ایک مجسم صورت تھی اور یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ خدا گویا ایک "مہیب سایہ" تھا خود انسان کے خیالات کا۔

اب اسی کے ساتھ اس کے ترقی یافتہ زمانہ کو دیکھئے کہ خدا کا مفہوم متعین کرنے کے لئے کسقدر عجیب و غریب ہانت و انشاء سے کام لیا گیا ہے۔

ایک فلاسفر کہتا ہے کہ خدا "عدیم التاثر قادر مطلق" (Passionless Absolute) ہے ایمرسن اسے کائنات کی روح برتر و اعلیٰ (Oversoul of the Universe) کہتا ہے۔ ہربرٹ اسپنسر اسے "ازلی و ابدی قوت" (Infinite and Eternal Energy) سے تعبیر کرتا ہے۔ ولیم جیمس اسے (Divine Move) کے الفاظ سے سمجھانا چاہتا ہے۔ برگسان اسے "محرک جوہری" (Vital Impulse) کے الفاظ سے ظاہر کرتا ہے، برنارڈ شا نے اسے "قوت حیات" (Life Force) کہا ہے۔ پروفیسر کرساپ اسے ایک "غیر مادی حقیقت" (Immaterial Reality) سمجھتا ہے۔ ہوریس برجز اسے "کائنات کا خیر کل" (Totality of Good in the World) بتاتا ہے۔ بعض اسے "فضا کو کبی کی روح" سے تعبیر کرتے ہیں بعض اسے دنیا کا انکل سام[1] (Uncle Sum) اور بعض اسے ایسا "روحانی ایتھر" سمجھتے ہیں جو وسعت زمان کو معمور کئے ہوئے ہے۔

---

[1] انکل سام سے مراد امریکہ ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ان تمام تعبیرات کا واقعی کوئی مفہوم ہے، کیا کوئی شخص ان تعبیرات سے خدا کے مفہوم کو متعین کرسکتا ہے۔ کیا ان کو پڑھنے کے بعد کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ اس نے خدا کی حقیقت کو سمجھ لیا۔

اس سے قبل جب انسان جاہل تھا اور اس کا ذہن زیادہ ترقی یافتہ نہ تھا اس نے خدا کو مادی چیزوں کی صورت میں پیش کیا جو ہرچند قابل قبول نہ تھا لیکن قابل تصور و قیاس تو تھا۔ مگر اب اس دور علم و ترقی میں تو خدا کو اسقدر مبہم بنا دیا گیا ہے کہ سوائے ذہنی مالیخولیا کے ہم کسی اور چیز سے تعبیر کر ہی نہیں سکتے۔ چنانچہ جو بیانات ابھی پیش کئے گئے ہیں آپ ان کے سمجھنے کیلئے پوری قوت صرف کر دیجئے لیکن آپ کسی متعین مفہوم تک پہونچنے میں بھی کامیاب نہ ہوں گے۔ صرف الفاظ و تراکیب ہیں جو مفہوم سے بالکل بیگانہ ہیں اور ان پر غور کرنا سوائے لایعنی ذہنی کشمکش کے اور کوئی معنی نہیں رکھتا۔ الغرض خدا صرف ذہن انسانی کی پیداوار ہے اور اختلاف ذہن کے ساتھ اس کا مفہوم بھی ہمیشہ بدلا ہے۔ جب انسان کی نگاہ مادی چیزوں سے ہٹ کر کسی اور طرف نہیں جا سکتی تھی تو اس نے درختوں، جانوروں، پہاڑوں، دریاؤں، اور انسانی بتوں کی صورت میں خدا کو سمجھنا چاہا اور اب کہ عقول انسانی نے ترقی کرکے خالص کیفیات کی تحلیل شروع کردی ہے، خدا نام رہگیا ہے صرف ان لغو و مہمل تاویلات کا جو دماغ کو اور زیادہ تشویش میں مبتلا کر دینے والی ہیں۔

مذہب یا خدا کے وجود کا خیال الہامی چیز ہے اس کی تردید خود الہامی مذاہب کے بیانات سے ہوتی ہے کیونکہ وہ عہد وحشت کے لوگوں کو گمراہ سمجھتے ہیں اور ان کی بت پرستی کو خلاف منشاء خداوندی قرار دیتے ہیں۔ اب رہگیا یہ امر کہ وہ کوئی فطری چیز ہے اور انسان نے پیدا ہوتے ہی سمجھ لیا تھا کہ خدا کا وجود ضروری ہے، سو میرے نزدیک اہل مذاہب اسکا ثبوت بھی پیش نہیں کرسکتے۔

اس مسئلہ کی چھان بین کے لئے سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ خود وحشی اقوام کی گزشتہ تاریخ کا مطالعہ کیا جائے اس میں شک نہیں کہ وحشی اقوام کے زمانہ کو ہم "زمانۂ قبل تاریخ" سے موسوم کرتے ہیں اور اس لئے ہمارے پاس کوئی ذریعہ اُن کے ابتدائی حالات معلوم کرنے کا نہیں ہے، لیکن چونکہ دنیا اس وقت بھی ان قوموں سے خالی نہیں ہے اس لئے ان کی موجودہ حالت سے ان کی گزشتہ حالت کا اندازہ بخوبی ہوسکتا ہے۔

اس وقت انتہائی پست درجہ کی قومیں ٹراڈل فگو، برازیل، لنکا، جزائر انڈمان، جزائر فلپائن، جزیرہ نمائے ملایا، اور جنوبی افریقہ میں پائی جاتی ہیں۔ ان کی پستی کا یہ عالم ہے کہ ان میں قبائلی زندگی کا بھی کوئی نظام نہیں پایا جاتا اور وہ اخلاقی پستی اس حد تک پائی جاتی ہے کہ ایک سے زیادہ گنتی بھی انھیں نہیں آتی اور وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ آگ کیونکر پیدا کی جاتی ہے۔

ٹراڈل فگو کی وحشی قوم یہگان کے متعلق کامل دو سال تک فرانسیسی علماء نے تحقیق کرکے جو رپورٹ شایع کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ خدا کے وجود کے قایل ہیں، نہ ان کے نزدیک خیر و شر کا کوئی مفہوم ہے۔ امید و خوف کا بھی کوئی جذبہ ان کے اندر نہیں پایا جاتا اور موت کے بعد وہ کسی اور عالم کے قایل نہیں ہیں۔

وسط برازیل کی وحشی اقوام کے عقاید میں بھی کوئی مذہبی جھلک نظر نہیں آتی سوائے اس کے کہ وہ سورج کو اچھا سمجھتے ہیں اور چاند کو برا جس کا سبب غالباً صرف یہ ہو سکتا ہے کہ چاند کا تعلق رات سے ہے جب درندے جنگل سے باہر نکل آتے ہیں اور سورج کا دن سے جب درندوں کا خوف نہیں رہتا۔ کسی کی پوجا نہیں کرتے اور نہ ان کا کوئی بت ہے۔ لنکا کی قدیم وحشی جماعتوں میں بھی کسی مذہبی پرستش کا وجود نہیں پایا جاتا اور ان کی زندگی کے کسی شعبہ سے اس امر کا پتہ نہیں چلتا کہ وہ خدا یا دیوتا کے قایل ہیں۔

ٹسمانیا کے صحرائی قبایل کے متعلق ڈاکٹر ٹکسن لکھتا ہے کہ "ان میں کسی مذہبی رسم کا پتہ نہیں چلتا اور یہ اپنے خیالات کے لحاظ سے بھی اتنے پست ہیں کہ ان کی زبان زیادہ تر اشارات پر مشتمل ہے چنانچہ رات کے وقت تو یہ آپس میں باتیں کر ہی نہیں سکتے۔

جزائر انڈمان کے وحشی قبایل ہر چند دوسری قوموں سے بہت کچھ متاثر ہو چکے ہیں تاہم مذہب یا عقیدۂ خدا کا وجود ان کے یہاں بھی نہیں پایا جاتا۔ جزائر فلپائن میں جن سیاحوں کو جانے کا اتفاق ہوا ہے ان کو معلوم ہے کہ وہاں کے قدیم باشندے بھی کوئی مذہب نہیں رکھتے۔ الغرض تمام وہ وحشی قومیں جو دوسری قوموں کی تہذیب سے متاثر نہیں ہوئی ہیں اب بھی خدا یا مذہب کی قایل نہیں ہیں اور اگر کسی قوم میں یہ خیال پیدا ہوا ہے تو وہ صرف دوسری قوموں سے ملنے جلنے کے بعد۔ اس لئے یہ کہنا کہ مذہب کا خیال انسانی فطرت میں داخل ہے کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ ابتدا یہ ادراک ذہنی ترقی کے ساتھ ساتھ کس کس رنگ میں یہ عقیدہ ظاہر ہوا اس سے بحث نہیں۔ ہم کو ہر ملک و قوم کے جغرافی ماحول کو پیش نظر رکھنا ضرور ہوگا اور بنا بریں یہ بحث کسی الہامی حقیقت سے متعلق نہ ہوگی بلکہ ماحول و اسباب ظاہری کی تاریخ سے تعلق رکھے گی اور اس صورت میں یہ مسئلہ کوئی خدائی مسئلہ نہیں رہتا بلکہ صرف ترقی تمدن کے تاریخ کا مسئلہ رہ جاتا ہے۔

چونکہ خدا اور مذہب صرف عقل انسانی کی پیداوار ہے اور عقل انسانی مختلف حالات کے ماتحت ہمیشہ مختلف رہی ہے اس لئے اگر آج عقاید مذہبی میں تمام افراد نوع انسانی ایک دوسرے سے متفق نہیں ہیں تو تعجب نہ کرنا چاہئے البتہ اگر دنیا یہ سمجھ لے کہ مذہب کا وجود انسانی زندگی کے لئے ضروری نہیں ہے اور ہم خدا کو مانے بغیر بھی اچھی زندگی بسر کر سکتے ہیں تو بیشک یہ ایک ایسے نقطہ کی طرف قدم بڑھانا ہوگا جو عقاید مذہبی کے تمام لغو اختلافات کو دور کر کے مرکزی حیثیت اختیار کر سکتا ہے

نگار جنوری ۱۹۳۵ء

جو صرف اردو شاعری کے لئے وقف تھا اور جس کے مطالعہ کے بعد نہ کسی تذکرہ دیکھنے کی ضرورت رہتی ہے نہ کسی اور تحقیق و جستجو کی۔ طلبہ، مدرسین اور انشا پردازوں کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ اردو شاعری کی تاریخ، اسکی عہد بہ عہد ترقی اور تجزیہ غرض لگوئی پر اتنا مواد یکجا کہیں نہیں ملسکتا۔ حجم ۲۳۶ صفحات قیمت علاوہ محصول دو روپیہ۔ منیجر نگار۔ لکھنؤ

اصغر گونڈوی کا جدید مجموعۂ کلام

سرودِ زندگی

(مسلسل)

اصغر صاحب کا شعر ہے:-

ع ازل سے تا ابد ہنگامۂ محشر بپا ہیں ادھر خاموشیِ لب کی آفت ادا کے سامنے

شعر کے دوسرے مصرعہ کو پڑھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کسی خاص وقت کا منظر پیش کر رہا ہے جس کی تصدیق (ہنگامۂ محشر) سے بھی ہوتی ہے لیکن پہلے مصرعہ میں "ازل سے تا ابد" کہکر اس تعیین کو مٹا دیا گیا ہے، گویا مقصود حشر کا بیان نہیں ہے بلکہ ازل سے ابد تک کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ اس لئے دونوں صورتوں میں انداز بیان بدلنا ضروری ہے۔

کہاں یہ شوق کی ناکامیوں کو دیکھئے حریفِ مطلبِ محبت جوشِ دعا کے سامنے

پہلے مصرعہ میں دو باتیں ظاہر کی گئی ہیں ایک "شوق کی کامیابی" اور اسی کے ساتھ اس کی "ناکامی" اور اس لئے اصولاً دوسرے مصرعہ میں ان دونوں باتوں کو ثابت کرنا چاہئے تھا۔ دوسرے مصرعہ میں دو چیزیں پیش کی ہیں "حریفِ مطلب کا محو ہو جانا" اور "جوشِ دعا" لیکن پہلے مصرعہ سے ان کا تعلق ظاہر نہیں ہوتا اور شوق کی کامیابی کے ساتھ ہی اس کی ناکامی ثابت نہیں ہوتی۔ کیونکہ حریفِ مطلب ادا ہونے سے پہلے ہی "جوشِ دعا" شروع ہو گیا اور دل کی بات زبان سے ظاہر نہ ہو سکی۔

نمودِ جلوۂ بیرنگ سے ہوش اس قدر گم ہیں کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

پہلے مصرعہ میں "جلوۂ بیرنگ" کا اقتضاء یہ تھا کہ "صورت" کا وجود ہی سرے سے نائب ہو جاتا، حالانکہ دوسرے مصرعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ "صورت" تو سامنے موجود ہے لیکن پہچانی نہیں جاتی۔ اس لئے اگر بجائے "جلوۂ بیرنگ" کے "جلوۂ نیرنگ" کہئے تو زیادہ موزوں تھا۔ اس طرح معنی یہ ہوتے کہ "نیرنگیِ جمال کا عالم ہو کہ وہی صورت جس کو کوئی وقت پہچانتے تھے اب شناخت

نہیں ہو سکتی۔

یہ عارضِ پُرنور، یہ زلفیں ہیں پریشاں کمبخت نکل گھر ہی شام و سحر سے

پہلے مصرعہ میں لفظ (ہیں) بالکل بے محل استعمال ہوا ہے اور اس نے مصرعہ کو مہمل کر دیا ہے۔ (یہ عارضِ پُرنور) کے مقابلہ میں صرف (یہ زلفِ پریشاں) کہنا چاہئے تھا تاکہ ترکیب کے لحاظ سے دونوں ٹکڑوں میں توازن پیدا ہو جاتا لیکن مصرعہ پورا کرنے کے لئے لفظ (ہیں) بڑھا کر مصرعہ تباہ کر دیا گیا۔

مے دافعِ آلام ہے تریاق ہے لیکن کچھ اور ہی ہو جاتی ہے ساقی کی نظر سے

پہلے مصرعہ میں (دافعِ آلام) اور (تریاق) دونوں زبانِ تغزل سے علٰحدہ ہیں، ان کا استعمال صرف ایک طبیب ہی کی زبان سے اچھا معلوم ہوتا ہے۔ علاوہ اس کے لفظ (لیکن) یہ ظاہر کرتا ہے کہ دوسرے مصرعہ میں مے کے دافع آلام و تریاق ہونے کی تردید کی جا رہی ہے حالانکہ مقصود اس کی ترقی ہے۔ تیسرا نقص یہ ہے کہ دوسرے مصرعہ میں (کچھ اور ہی) کے بعد جب تک لفظ (چیز) نہ بڑھایا جائے مفہوم پورا نہیں ہو سکتا۔

نظارۂ پرشوق کا اک نام ہے جینا مرنا اسے کہئے کہ گزرتے ہیں ادھر سے

پہلے مصرعہ میں لفظ (اک) بالکل زاید ہے۔ دوسرے مصرعہ کا انداز بیان ناقص ہے۔ شاعر کا مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ۔ "زندگی نام ہے صرف نظارۂ پرشوق کا اس لئے جب ہم ختم نظارہ کے بعد ادھر سے گزر جائیں تو اسے مرنا کہنا چاہئے" دوسرے مصرعہ میں (گزرتے ہیں) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ گزرنا ختم نہیں ہوا اس لئے مرنا بھی ثابت نہیں ہو سکتا۔ بجائے (گزرتے ہیں) کے (گزر جائیں) کہنا چاہئے تھا۔

ذرا سی آس ملنا چاہئے دردِ محبت کی کہ خود بے چین ہو ذوقِ نوا سے بزمِ فطرت کی

اس شعر سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ دردِ محبت کی تمنا کس کو ہے شاعر کو یا خود بزمِ فطرت کو جو "ذوقِ نوا" سے بے چین ہو۔ اس لئے بجائے (ملنا چاہئے) کے (مجھ کو چاہئے) نظم کرنا چاہئے تھا۔ تعین بھی ہو جاتی اور (ملنا چاہئے) کا ثقل بھی دور ہو جاتا۔

نقاب رخ الٹ کر آج کیوں گرمِ تبسم ہو شعاعیں مجھ پہ کیوں پڑتی ہیں خورشیدِ قیامت کی

بجائے (گرمِ تبسم) کے (سرگرمِ تبسم) ہونا چاہئے تھا۔

یہ سب ناآشنائے لذتِ پرواز ہیں شاید اسیروں میں ابھی تک شکوۂ صیاد ہوتا ہے

یہ شعر بالکل مفہوم سے بیگانہ ہے۔ اگر اسیر شکوۂ صیاد کرتے ہیں تو اس سے انکا ناآشنائے لذت پرواز ہونا کیونکر ظاہر ہوتا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں (ابھی تک) سے کیا مراد ہے؟ اس کو شاعر ظاہر نہ کر سکا۔

مجاز کیسا، کہاں حقیقت، ابھی تجھے کچھ خبر نہیں ہے یہ سب ہے اک خواب ہی کی حالت جو دیکھتا ہے سحر نہیں ہے

پہلے مصرعہ میں بجائے (کہاں) کے (کیسی) زیادہ مناسب تھا۔ دوسرے مصرعہ میں لفظ (سحر) بالکل بے محل استعمال ہوا ہے۔ مراد یہ کہنا ہے کہ "یہ سب خواب کی سی حالت ہے بیداری و حقیقت نہیں" اور یہ لفظ (سحر) سے ظاہر نہیں ہوتا۔

یہ مجھ سے سُن کے تو آرہا ہیں سلامتی خود ہے دشمنِ جاں کہاں سے رہروِ زندگی ہو گمراہ جب پرِ خضر نہیں ہے

دوسرے مصرعہ میں لفظ (کہ) زاید استعمال ہوا ہے صرف وزن پورا کرنے کے لئے ہے۔

ہوا کو موج شراب کر دے، فضا کو مست و خراب کر دے یہ زندگی کو شباب کر دے، نظر تمہاری نظر نہیں ہے

نظر نہیں ہے تو کیا ہے جو یہ سب کچھ کر سکتی ہے۔ اس کا ذکر اشارتاً و کنایتاً بھی کہیں نہیں پایا جاتا۔

دولتِ قرب کو خاصانِ محبت جانیں چند اشکوں کے سوا کچھ مری قسمت میں نہیں

جب تک دوسرے مصرعہ میں لفظ (ہر چند) یا (گو) نہ لایا جائے، مفہوم تشنہ رہتا ہے۔

لوگ مرتے بھی ہیں، جیتے بھی ہیں، بیتاب بھی ہیں کونسا سحر تری چشمِ عنایت میں نہیں

یہ شعر ہندی کے اس مشہور دوہے سے ماخوذ ہے:۔

امی ہلاہل مدھ بھرے سویت سیام رتنار جیت مرت جھک جھک پرت جہ چیتت اکبار

لیکن مفہوم کے لحاظ سے بجائے ترقی کے تنزل پایا جاتا ہے۔

سب ہے اک طرزِ جدا سب سے اک آہنگ جدا رنگِ محفل میں ترا جو ہے وہ خلوت میں نہیں

شاعر کا مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ میرے محبوب کا جو رنگ جلوت میں ہوتا ہے وہ خلوت میں نہیں ہوتا۔ پہلے مصرعہ کے انداز بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر یہ صفت صرف اپنے ہی محبوب میں پاتا ہے حالانکہ "جلوت و خلوت" میں

کیفیات کا بدل جانا نفسیاتی طور پر ہر شخص کے لئے ثابت ہے۔ دوسرا مصرعہ یوں بہتر ہوتا:۔

رنگ محفل میں جو تیرا ہے وہ خلوت میں نہیں

اس طرح (رنگ محفل) کے بجائے (تیرا) پر زور ہو جاتا اور مفہوم سے قریب تر۔

نشۂ عشق میں ہر چیز اڑی جاتی ہے کون ذرہ ہے کہ سرشار محبت میں نہیں

چونکہ پہلے مصرعہ میں یہ کہا تھا کہ "نشۂ عشق میں ہر چیز اڑی جاتی ہے" تو دوسرے مصرعہ میں یوں کہنا چاہئے تھا کہ "کونسی چیز ہے جو محبت میں سرشار نہیں" یا "ذرہ ذرہ سرشار محبت ہے"

لالہ و گل تم نہیں ہو مہ و انجم تم ہو رنگ محفل بن کے لیکن کون اس محفل میں ہے

لالہ و گل کا تعلق تو رنگ محفل سے ہے لیکن مہ و انجم کو رنگ محفل سے کیا تعلق؟ محفل کے ساتھ تو کوئی ایسا لفظ لانا چاہئے جو مصرعۂ اول کی رعایت سے لالہ و گل اور مہ و انجم دونوں سے متعلق ہو سکے۔ اس لئے بجائے رنگ کے (تاب) زیادہ مناسب تھا۔

ہو کے رازِ عشق افشا بن گیا اک راز اور سب زباں پر آ چکا ہو سب ابھی تک دل میں ہے

رازِ عشق کا ظاہر ہو کر راز ہو جانا اور زبان پر آنے کے بعد بھی اس کا بالکل ناگفتہ حالت میں رہنا، اک ایسا معمہ ہے جس کا حل کرنا آسان نہیں۔ یہ شعر بھی تصوف کے ان اشعار میں سے ہے جہاں جمع اضداد ہی انتہائے کمال خیال کیا جاتا ہے

حسن بنکر خود کو عالم آشکارا کیجئے پھر مجھے پردہ بنا کر مجھ سے پردہ کیجئے

ایں ہم منجملہ دیگر خیالات لغویۂ تصوف ہست، کہ شاعران کم سواد، تغزل را برایشاں سازی کنند و تراکیب حاملۂ اضداد را حسن شاعری می نامند!

دیکھتا ہوں میں کہ انساں گم ہے دریائے وجود خود حباب و موج بنکر اب تماشہ کیجئے

اگر دریائے وجود انسان گم ہے تو حباب و موج بنکر تماشہ دیکھنے سے کیا فایدہ مترتب ہو سکتا ہے۔ اگر مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ جب دریائے وجود خود فنا کر دینے والا ہے تو پھر کیوں نہ ایسی چیز بنکر تماشہ کیا جائے جو خود بہت جلد فنا ہو جانے والی ہے تو اس کے لئے (حباب) بنکر تماشہ کرنا تو صحیح ہو سکتا ہے مگر موج سے اسے کوئی واسطہ نہیں، کیونکہ موج کا وجود دریا سے علحدہ نہیں ہے اور نہ وہ حباب کی طرح فنا ہو جانے والی۔

حُسن کی بیگانگی و بے نیازی سب بجا　　اُس پہ چھپ کر پردۂ گل سے اشارہ کیجئے

شاعر اپنے مفہوم کو ظاہر نہیں کر سکا مقصود یہ کہنا ہے کہ اگر حُسن بے نیاز ہے تو وہ چھپ کر پردۂ گل سے کیوں اشارہ کرتا ہے، دوسرا مصرعہ یوں ہوتا تو ابہام دور ہو جاتا:۔

چھپ کے پھر کیوں پردۂ گل سے اشارہ کیجئے

کوئی ایسا نہیں یارب کہ جو اس درد کو سمجھے　　نہیں معلوم کیوں خاموش ہے دیوانہ برسوں سے

اس شعر میں بھی (کہ) بالکل بیکار ہے۔ اصغر صاحب وزن پورا کرنے کے لئے "یہ۔ کہ۔ کچھ" کے الفاظ اکثر و بیشتر استعمال کرتے ہیں، جس سے ان کی بے مشقی ظاہر ہوتی ہے۔ پہلا مصرعہ یوں بھی ہو سکتا تھا:۔

کوئی ایسا نہیں یارب جو اس کے درد کو سمجھے

دے مسرت مجھے اور عین مسرت تجھ کو　　یا سمجھ غم، مرا انداز و راحت مجھ کو

مسرت اور عین مسرت میں "غم و راحت" کا سا تفاوت [illegible] ہے۔ اول تو مسرت اور عین مسرت کو علاحدہ علاحدہ دو چیز قرار دینا ہی لغو سی بات ہے چہ جائیکہ عین مسرت کو غم سے تعبیر کرنا! علاوہ اس کے دوسرا نقص یہ ہے کہ غم کا تقابل راحت سے نہیں ہوا کرتا بلکہ مسرت سے ہوا کرتا ہے۔

خود میں اُٹھ جاؤں کہ یہ پردۂ ہستی اُٹھ جائے　　[illegible]

یہ شعر بیان و معنی دونوں حیثیت سے ناقص ہے۔ مفہوم کے لحاظ سے پہلے مصرعہ کا انداز بیان ایسا ہونا چاہئے تھا کہ "میں خود ہی کیوں نہ اُٹھ جاؤں کہ یہ پردۂ ہستی اُٹھ جائے"۔ اسی طرح دوسرے مصرعہ میں جب تک "عنوان" کے بعد لفظ (سے) نہ لایا جائے مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ "کسی عنوان دیکھنا" خلاف محاورہ ہے۔ عنوان کا اعلان (ؤں) اور اس کے بعد (سے) لانا ضروری ہے۔

معناً یہ نقص ہے کہ خود اُٹھ جانا اور پردۂ ہستی اُٹھ جانا ایک ہی چیز ہے۔ ان دونوں کو علاحدہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ اس قسم کے امتیازات ممکن ہے تصوف کی لایعقل دنیا میں کوئی مفہوم رکھتے ہوں لیکن تغزل سے انھیں کوئی تعلق نہیں

آگئی سامنے اک جلوۂ رنگیں کی بہار　　عشق نے آج دکھا دی مری صورت مجھ کو

اس شعر میں بھی تصوف کا وہی فرسودہ و پامال اور لغو و مہمل نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ "یہ جو صورت ہے مری صورتِ جاناں ہے وہی"

نگہِ ناز کو یہ بھی تو گوارا نہ ہوا اک ذرا درد میں ملتی تھی جو راحت مجھ کو

دوسرے مصرعہ میں لفظ (جو) کے لحاظ سے پہلے مصرعہ کا انداز بیان بالکل غلط ہے۔ اگر دوسرے مصرعہ میں لفظ (جو) برقرار رکھا جائے تو پہلا مصرعہ یوں ہونا چاہئے:۔

نگہِ ناز کو وہ بھی تو گوارا نہ ہوئی ؂

اور اگر پہلا مصرعہ اپنے حال پر قایم رہے تو دوسرا مصرعہ یوں ہونا چاہئے:۔

اک ذرا درد میں مل جاتی تھی راحت مجھ کو

خوشا وہ دن کہ حسن یار سے جب عقل خیرہ تھی یہ سب محرومیاں ہیں آج ہم جتنا سمجھتے ہیں

مفہوم کے لحاظ سے دوسرا مصرعہ بہت اچھا ہوا ہے اور مدعا ظاہر کرنے سے قاصر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ "وہ دن اچھے تھے جب پرتوِ حسن نے عقل کو خیرہ کر رکھا تھا لیکن اب ہم جتنا سمجھنے لگے ہیں اتنی ہی محرومیاں بڑھتی جاتی ہیں"

نظر بھی آشنا ہو نشۂ بے نقش و صورت سے ہم اہلِ راز سے رنگینیِ مینا سمجھتے ہیں

نشہ ایک کیفیت ہے جو نقش و صورت سے ہمیشہ بے نیاز رہتی ہے اس لئے یہ تخصیص بیکار ہے۔ علاوہ اس کے دوسرے مصرعہ میں رنگینیِ مینا کا ذکر موجود ہے جو مرئی چیز ہے اس لئے اسے نشۂ بے نقش و صورت کیونکر کہہ سکتے ہیں۔

عجب اعجاز فطرت ہے اسیروں کو بھی حیرت ہے وہ موجِ بوئے گل کا خود تڑپ کر بال و پر ہونا

دوسرے مصرعہ میں "موجِ بوئے گل" کا بال و پر ہونا ظاہر کیا ہے درانحالیکہ اس کا کوئی ثبوت شعر میں موجود نہیں ہے۔ شاعری میں اس نوع کا ادعا عام چیز ہے اور محال کو ممکن کہہ دینا کوئی نئی بات نہیں، لیکن اگر اس کی کوئی توجیہ و تاویل شعر میں موجود نہ ہو تو اسے معیوب سمجھا جاتا ہے۔

ابھی یہ طرزِ مستی مجھ سے سیکھیں میکدے والے نظر کو چند موجوں پر جما کر بے خبر ہونا

پہلے مصرعہ کا لفظ (ابھی) بالکل زاید استعمال ہوا ہے اور دوسرے مصرعہ میں ردیف غلط ہے کیونکہ مفہوم کے لحاظ سے (ہونا) کی جگہ (ہو جانا)' چاہئے۔

یہاں میں ہوں نہ ساقی ہے نہ ساغر ہے نہ صہبا ہے یہ میخانہ ہے اس میں معصیت ہے باخبر ہونا

اس شعر کی ردیف بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ ہونا بجائے (رہنا) کے استعمال کیا گیا ہے۔

پھر وہی واماندگی ہے پھر وہی بیچارگی ایک موجِ بوئے گل کو بال و پر سمجھا تھا میں

دونوں مصرعے غیر مربوط ہیں۔ (پھر) کا لفظ مقتضی ہے اس مفہوم کا کہ اس سے قبل واماندگی بیچارگی عارضی طور پر غائب ہو گئی تھی۔ حالانکہ دوسرے مصرعہ میں موجِ بوئے گل کو بال و پر سمجھنے کی غلطی کا اعتراف ایسے الفاظ میں کیا گیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ موجِ بوئے گل نے کبھی بال و پر کا کام نہیں دیا اس لئے واماندگی دور ہونے کی کوئی صورت نہ تھی علاوہ اس کے دوسرے مصرعہ میں لفظ (ایک) بیکار استعمال کیا گیا ہے۔

یہ تو شب کو سر بہ سجدہ ساکن و مدہوش تھے ماہ و انجم کو تو سرگرمِ سفر سمجھا تھا میں

پہلے مصرعہ میں ماہ و انجم کی تین حالتیں بیان کی گئی ہیں جن میں سے "ساکت" کو تو غلط نہیں کہہ سکتے کیونکہ رات کے وقت ان کی حالت بظاہر ایسی ہی معلوم ہوتی ہے لیکن مدہوش سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی اور سر بسجدہ کہنا تو بالکل غلط ہو گیا مفہوم سودا بالکل مبہم ہے۔ کیونکہ جب تک یہ نہ بتایا جائے کہ ماہ و انجم کے سکوت کا کیا سبب تھا شعر حدودِ تغزل سے باہر رہتا ہے۔

دیر ہی سے مجھ پہ کھولی راہ جانِ عشق راہبر کو اک فریبِ رہگزر سمجھا تھا میں

اگر راہبر کو فریبِ رہگزر سمجھنا غلطی تھی تو اس کا تعلق دیر سے کیا اور اس کا "راہ سے جانِ عشق" کی طرف ہدایت کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ شاعر اپنا مدعا ظاہر کرنے میں بالکل کامیاب نہیں ہوا۔ اگر یہ کہا جائے کہ دیر اور راہبر کو ایک ہی چیز قرار دیا گیا ہے تو یہ اور زیادہ لغو تاویل ہوگی۔

اسی زمین کے چند اور اشعار ملاحظہ ہوں:۔

تا طلوعِ جلوۂ خورشید پھر آنکھیں ہیں بند تجھ کو اے موجِ فنا نورِ سحر سمجھا تھا میں
مست و بیخود ہیں مہ و انجم زمین و آسماں یہ تری محفل تھی جس کو رہگزر سمجھا تھا میں
جان ہے محوِ تجلی چشم و گوش و لب ہیں بند حسن کو حسنِ بیاں حسنِ نظر سمجھا تھا میں

پہلے شعر میں موجِ فنا کا نورِ سحر سے کوئی تعلق نہیں۔ "موجِ تاریک فنا" یا "شبِ تاریک فنا" کہنا چاہئے تھا۔
دوسرا شعر بالکل بے معنی ہے۔ تیسرے میں مثنوی مولانا روم کے اس شعر سے استفادہ کیا گیا ہے۔

چشم بند لب ببند و گوش بند گر نہ بینی سرِ حق بر ما بخند

دوسرے مصرعہ کے انداز بیان کو دیکھتے ہوئے خیر چشم و لب کا بند ہونا تو سمجھ میں آتا ہے، لیکن گوش کا ذکر بالکل بیکار ہو جاتا ہے۔

روزِ روشن، یا شبِ مہتاب یا صبحِ چمن ہم جہاں سے چاہتے وہ روئے زیبا دیکھتے

اول تو پہلے مصرعہ میں لفظ (سے) بالکل بیکار ہے۔ صحیح اندازِ بیان یہ ہونا چاہئے تھا کہ

چاہتے جس چیز میں ہم روئے زیبا دیکھتے

دوسری معنوی غلطی ردیف سے پیدا ہوئی ہے۔ جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ شاعر نے "وہ روئے زیبا" کسی چیز میں نہیں دیکھا اور اس کا جلوہ کسی چیز میں اس کو نظر نہ آیا، حالانکہ ایک عاشق ہر جگہ معشوق کا جلوہ دیکھ سکتا اور دیکھتا ہے۔

صد زماں و صد مکاں واں جہاں و آں جہاں تم نہ آجاتے تو ہم وحشت میں کیا کیا دیکھتے

پہلا مصرعہ بالکل بدلدینے کے قابل ہے اور یکسر حدودِ تغزل سے باہر۔

سیکڑے ہیں زندگی ہے شورِ نوشا نوش سے مٹ گئے ہوتے اگر ہم جام و مینا دیکھتے

شاعر غالباً یہ کہنا چاہتا ہے کہ میکدے میں آثارِ زندگی صرف اس کیفیت سے پیدا ہیں کہ واں شورِ نوشا نوش پایا جاتا ہے۔ اگر جام و مینا میسر آجاتا یعنی شراب پی لیتے تو یہ زندگی نہ پائی جاتی۔ لیکن اصغر صاحب چونکہ فارسی ادب پر عبور نہیں رکھتے اس لئے انھوں نے نوشا نوش کے معنی صرف "ہنگامۂ طلب بادہ" کے سمجھے ہیں حالانکہ نوشا نوش کے معنی ہی ہیں "پے در پے پینے" کے۔ اور اس لئے شعر مہمل ہوگیا۔

ذاقِ زندگی سے آشنا چرخِ بریں ہوتا مہ و انجم سے بہتر ایک جامِ آتشیں ہوتا

چرخِ بریں میں ایک ایسی چیز آفتاب موجود ہے جسے "جامِ آتشیں" کہہ سکتے ہیں۔ چونکہ "جامِ آتشیں" استعارتاً "جامِ مے" کے لئے استعمال کیا گیا ہے اس لئے بجائے مہ و انجم کے "آفتاب" ہی کا ذکر مناسب تھا نہ کہ "مہ و انجم" کا۔

وہ نغمۂ بلبلِ رنگیں نوا اک بار ہو جائے کلی کی آنکھ کھل جائے چمن بیدار ہو جائے

پہلے مصرعہ میں دو نقص ہیں ایک یہ کہ بجائے (وہی) کے (وہ) استعمال کیا گیا ہے اور دوسرا یہ کہ لفظ (پھر) نہیں لایا گیا حالانکہ بغیر اس کے مفہوم پوری طرح ادا نہیں ہو سکتا۔ اصل میں عبارت اس طرح ہونا چاہئے تھی کہ:۔

"اے بلبلِ رنگیں نوا وہی نغمہ پھر اک بار ہو جائے"

تم اس کافر کا ذوقِ بندگی اب پوچھتے کیا ہو جسے طاقِ حرم بھی ابروئے خمدار ہو جائے

پہلے مصرعہ میں لفظ (اب) بیکار ہے۔ اس کو یوں دور کیا جا سکتا تھا:۔

تم اُس کافر کے ذوقِ بندگی کو پوچھتے کیا ہو

نظر اس حُسن پر ٹھہرے تو آخر کس طرح ٹھہرے کبھی جو پھول بن جائے کبھی رخسار ہو جائے

پہلے مصرعہ میں "نظر نہ ٹھہر سکنے" کا ذکر ہے اور اس لئے مصرعۂ ثانی میں کسی نہ کسی ایسی چیز کا بیان ضروری تھا جس پر واقعی نظر نہیں ٹھہر سکتی۔ درانحالیکہ پھول اور رخسار دونوں چیزیں ایسی نہیں جن پر نگاہ نہ ٹھہر سکے۔ میری رائے میں اگر بجائے پھول کے (برق) کر دیا جائے تو یہ نقص دور ہو سکتا ہے۔

کچھ ایسا دیکھ کر چپ ہوں بہارِ عالمِ امکاں کوئی اک جام پی کر جس طرح سرشار ہو جائے

پہلے مصرعہ میں تعقید ہے کیونکہ (دیکھ کر) (بہارِ عالمِ امکاں) سے دور پڑ گیا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں لفظ (اک) نے معنوی نقص پیدا کر دیا ہے، کیونکہ سرشاری کا اقتضاء یہ نہیں تھا کہ صرف اک جام پینے کا ذکر کیا جائے، بلکہ "پیاپے جام پینے" کا اظہار ہونا چاہئے تھا۔

میری سرشک خوں میں ہے رنگینیِ حیات یارب فضائے حُسن، ابد تک جواں رہے

فضا کا جوان رہنا بالکل مہمل بات ہے۔

اے مجاز کچھ یا اسے حجاب کہو نگاہِ شوق ہے اک اضطراب پیہم سے

دوسرے مصرعہ کے انداز بیان کو لفظ (ہے) نے بہت گرا دیا۔ یہ مصرعہ یوں ہونا چاہئے تھا:۔

نگاہِ شوق ہے اک اضطراب پیہم سے

تو اے شعلہ طراز و بہارِ حُسنِ بتاں کوئی مٹے تو تری یہ ادا بھی کیا کم ہے

اس شعر کا صحیح مفہوم متعین کرنے کے لئے لفظ تری کا مخاطب تلاش کرنا ضروری ہے۔ اگر مخاطب یہی دنیاوی معشوق ہے تو مصرعۂ اول میں حُسن کے ساتھ (بتاں) کی تخصیص بے معنی ہو جاتی ہے کیونکہ اس صورت میں تمام دنیا کے بتوں یا معشوقوں کا ذکر بے محل ہے، صرف مخاطب ہی کے حُسن کا بیان ہونا چاہئے۔ لیکن اگر مخاطب خدا ہے تو پھر "اے شعلہ طراز" کے ساتھ کسی ایسے لفظ کا اضافہ ضروری تھا جو "حُسنِ بتاں" کی کوئی تخصیص رکھتا، مثلاً:۔

فروغِ نغمۂ بلبل، طرازِ حُسنِ چمن کوئی مٹے تو تری یہ ادا بھی کیا کم ہے

لیکن اگر مخاطب اسی دنیا کی کوئی ہستی ہے تو پہلا مصرعہ بدلکر شعر یوں بنایا جا سکتا ہے۔

وہ مجھ سے پھیر کے منھ تیرا مسکرا دینا کوئی مٹے تو تری یہ ادا بھی کیا کم ہے

مگر اصغر صاحب اسے کیوں پسند کرنے لگے کیونکہ اس اصلاح سے یہ شعر صحیح تغزل کے حدود میں آجاتا ہے۔

کہاں زمان و مکاں پھر کہاں یہ ارض و سما جہاں تم آئے یہ ساری بساط برہم ہے

اگر لفظ (پھر) استعمال کیا تھا تو (زمان و مکان) کے ساتھ بھی اس کو لانا چاہئے تھا ورنہ کہیں نہیں۔ بجائے پھر کے (اور) لا سکتے تھے۔

عشق کا ارشاد پہلو میں ہو بلبل کا جگر عقل کہتی ہے رگِ گل میں گلستاں دیکھئے
تیز گامی سخت کوشی عشق کا فرمان ہے علم کا اصرار ذرہ میں بیاباں دیکھئے

ان دونوں شعروں میں عشق و عقل کا استعمال غلط ہوا ہے۔ جہاں عشق ہے وہاں عقل کا لفظ ہونا چاہئے اور جہاں عقل ہے وہاں عشق۔

قالبِ جاں میں جگا شرارِ زندگی دیکھئے بوئے قمیصِ ماہِ کنعاں دیکھئے

(بُو) دیکھی نہیں جاتی۔

ایک مدت سے تری بزم سے محروم ہوں میں کاش وہ چشمِ عنایت بھی تری یاد نہ ہو

پہلے مصرعہ میں (سے) کی تکرار ناگوار ہے۔ دوسرے مصرعہ میں (یاد نہ آئے) کی جگہ (یاد نہ ہو) استعمال کیا گیا ہے۔ اگر ردیف کی مجبوری نہ ہوتی میں اس شعر کو اس طرح کر دیتا:-

ایک مدت سے ہوں محروم تماشا اے کاش وہ تری چشمِ عنایت بھی مجھے یاد نہ آئے

حُسن کو وسعتیں جو دیں عشق کو حوصلہ دیا جو نہ ملے نہ مٹ سکے وہ مجھے مدعا دیا

اس شعر کے مصرعے باہم گر مربوط نہیں ہیں اور دوسرا مصرعہ پہلے سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ اگر حسن کو وسعتیں ملی ہیں تو عشق کو بھی اسی انداز سے حوصلہ عطا ہوا ہے اور یہ مفہوم پہلے مصرعہ سے ادا ہو گیا۔ لیکن اگر مراد یہ ہے کہ "عشق کا حوصلہ" حقیقتاً وہی مدعا ہے جو نہ پورا ہو سکتا ہے نہ دل سے نکل سکتا ہے تو یہ تعبیر غلط ہے۔ "حوصلۂ عشق" کا اقتضاء اول تو یہ ہے کہ وہ مدعا سے یکسر بے نیاز ہو لیکن اگر کسی مدعا کا ہونا ضروری قرار پائے تو بھی اسے تکمیل و عدم تکمیل کی خواہش سے مستغنی ہونا چاہئے۔ الغرض دوسرا مصرعہ پہلے سے کوئی خاص ربط نہیں رکھتا۔ یہ تو معنوی نقص ہوا۔ اب نقص بیان کو دیکھئے کہ اگر مصرعۂ ثانی کی نثر کیجائے تو عبارت یوں ہوگی: "مجھے وہ مدعا دیا جو نہ ملے نہ مٹ سکے" حالانکہ مدعا بہ لحاظ زبان نہ ملتا ہے نہ مٹ سکتا ہے۔ محاورہ - مدعا پورا ہونا یا نہ ہونا - مدعا پانا یا نہ پانا - مدعا حاصل ہونا یا نہ ہونا ہے۔

(باقی)

دلوں کی آگ

احمد یار خاں کا عقیدہ تھا کہ "روپیہ حاصل کرو خواہ وہ ایمانداری سے حاصل ہو یا بے ایمانی سے" جب وہ پہلی مرتبہ قصبہ چوسی میں آئے تو ان کا کل سرمایہ کپڑوں کی ایک گٹھری تھا لیکن قصبہ کا ماحول ان کے لئے اسقدر موافق ثابت ہوا کہ چند مہینے میں کپڑوں کی دوکان کے مالک ہو گئے۔ بعض اوقات جب روپیہ جمع ہونا شروع ہوتا ہے تو اس قدر تیزی سے کہ خود جمع کرنے والے کو اس پر حیرت ہونے لگتی ہے۔ یا تو خانصاحب کی یہ حالت تھی کہ دن بھر گاؤں کی پھیری کر کے جو کچھ کماتے تھے وہ شام کو صرف ہو جاتا تھا اور دن بھر کی محنت میں وہ چند گز سے زیادہ کپڑا نہ فروخت کر سکتے یا اب یہ حالت تھی کہ ان کی دوکان پر خریداروں کی کثرت سے جگہ نہ ملتی تھی کیونکہ وہ نقد کے علاوہ اُدھار بھی کپڑا دیا کرتے تھے اور فصل پر ۵ فیصدی سود کے حساب سے دام وصول کیا کرتے تھے۔ چند سال میں خانصاحب کا کاروبار اتنا بڑھا کہ ان کو منیب اور کارندے رکھنا پڑے اور اب وہ کپڑوں کے علاوہ نقد روپیہ کا بھی لین دین کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ انکی مالی حالت گاؤں میں سب سے اچھی ہو گئی اور کچھ جائداد بھی خانصاحب نے خرید لی۔ وصولی کا یہ انداز تھا کہ جو رقم منیب وغیرہ سے نہ وصول ہوتی، خانصاحب لٹھ لیکر وصول کر لاتے۔ سختی خانصاحب کی فطرت تھی وہ کچہری دربار نہیں جانتے تھے انھوں نے یہ سب طاقتیں اپنے لٹھ میں جمع کر لی تھیں۔ جہاں تک ممکن ہوتا وہ اسی کے ذریعہ سے اپنا روپیہ وصول کرتے تھے اور رحم ان کے نزدیک بے معنی لفظ تھا۔ انھوں نے روتے ہوئے بچوں اور پریشان عورتوں پر بھی کبھی رحم نہ کیا اور اپنے سامنے گائے بھینسیں کھلوا کر لے گئے۔

چودہ پندرہ برس میں خانصاحب کا کاروبار چوسی کے علاوہ ملحقہ گاؤں میں بھی پھیل گیا اور اس جوار میں تقریباً ہر شخص خانصاحب سے مرعوب تھا جو قرضدار تھے وہ قرضہ کے دباؤ سے سر نہ اُٹھا سکتے تھے اور جو قرضدار نہ تھے وہ خانصاحب کی شورہ پشتی سے مرعوب تھے کیونکہ وہ قرضداروں کی بے عزتی آئے دن دیکھتے رہتے تھے۔

خانصاحب کا ذریعہ آمدنی یہی کاروبار نہ تھا بلکہ چوری کا مال بھی خفیہ طور پر خرید کر کے بیچتے تھے اور افیون کی تجارت بھی کرتے تھے۔

خانصاحب سے زیادہ تکلیف دہ وجود ان کے نوکروں کا تھا، بات بات پر لوگوں کو ذلیل کرنا ان کا دلچسپ مشغلہ تھا اہل قصبہ خانصاحب کے خوف سے ان سے بھی ڈرتے تھے، خانصاحب اپنی کارروائیوں کو جایز و برقرار

رکھنے کے لیے تھانیدار کو اسی قدر رقم دیا کرتے تھے جسقدر تنخواہ اس کو ریاست سے ملتی تھی گاؤں والوں نے ان کے نوکروں سے تنگ آکر کئی درخواستیں حکام بالا کی خدمت میں بھیجیں لیکن جب تھانہ میں پہونچیں تو الٹی درخواست دینے والوں کی توہین کی گئی اور دھمکیاں دی گئیں اس لئے غریبوں نے مجبور ہوکر شکایت کرنا بھی چھوڑ دیا لیکن ان کے دلوں میں خانصاحب کی طرف سے آگ بھری ہوئی تھی ایک موقعہ تو ایسا آگیا کہ اگر خانصاحب دانشمندی کا ثبوت نہ دیتے تو نہ معلوم کیا ہوجاتا ان کے نوکر نے ایک عورت کو سرِ بازار چھیڑ دیا اس پر سارا بازار مشتعل ہوگیا لیکن بعض نے سمجھا کر لوگوں کو روکا اور خانصاحب سے اس کی شکایت کی خانصاحب نے موقعہ کی نزاکت کا خیال کرکے نوکر کو مار کر نکال دیا گاؤں والے اس پر مطمئن ہوکر چلے گئے اگرچہ یہ فعل نمائشی تھا۔

خانصاحب اپنی چیرہ دستیوں کے ساتھ سخت مذہبی آدمی بھی تھے گاؤں میں جو مسجد ویران پڑی تھی وہ خانصاحب کے دم سے آباد ہوئی خود پنجوقتہ نماز باجماعت ادا کرتے اور دوسروں کو مجبور کرکے نماز پڑھاتے یہاں تک کہ بعض آدمیوں کو قرض خانصاحب نے صرف اسوجہ سے دیا کہ وہ نماز میں پنجوقتہ شریک ہوتے تھے ۔ خانصاحب کی بیرونی زندگی جسقدر پریشان کن تھی اس سے زیادہ تباہ کن خانگی زندگی تھی ، جسوقت وہ گھر میں خوفناک انداز سے داخل ہوتے ہر شخص لرزہ براندام ہوجاتا کہ دیکھئے کس کی شامت آتی ہے، ہر ہر بات پر اعتراض کرتے اور آخر میں ان تمام بدانتظامیوں کی ذمہ دار انکی بیوی قرار پاتیں اور ان کو ناحق صلواتیں سننا پڑتیں، نوکر تو ان کی طبیعت جان گئے تھے اس لئے وہ پہلے ہی غائب ہوجاتے تھے اور ان تمام باتوں کی جواب دہی کے لئے صرف گھر والے رہ جاتے تھے اور پھر اس پر قیامت یہ کہ کوئی عذر قابل قبول نہیں کوئی جواب قابل پذیرائی نہیں۔

(۲)

محمد حسن خانصاحب کا بڑا لڑکا خانصاحب کا نقش ثانی تھا کیونکہ دوسروں پر سختی کرنے میں خانصاحب سے کم نہ تھا، ممکن تھا کہ محمد حسن اپنے باپ جیسا نہ ہوتا لیکن چونکہ انسان ماحول سے بنتا اور بگڑتا ہے اس لئے اس کی لغزشیں قابل درگزر تھیں، دنیا میں بداطوار دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو بُرے ماحول کو اچھا سمجھ کر اس کے اثرات سے مرعوب ہوجاتے ہیں اور تباہ ہوتے ہیں دوسرے وہ جن کو زمانہ ٹھوکریں دے دیکر راہ راست سے برگشتہ کردیتا ہے اور وہ زندگی کے کسی حصہ میں کامیاب نہ ہوکر اپنی ناکامی کا انتقام دوسروں سے لیتے ہیں۔ پہلی صورت صرف افسوسناک ہے اور دوسری تباہ کن اور غارت گر بھی۔ اس لئے محمد حسن کی زندگی کا وہی انداز تھا جو اس کے باپ کا۔ وہی خشونت وہی ظلم و تعدی جو اس کے باپ کی خصوصیات تھیں رفتہ رفتہ اس کی فطرت ثانیہ بنتی جاتی تھیں، مگر باوجود ان تمام باتوں کے وہ اپنے باپ کی طرح جذبات لطیف سے محروم نہ تھا وہ ظلم کو ظلم جان کر کرتا تھا نہ کہ حق، اس کے علاوہ اس کا چال چلن صاف تھا اور اس معاملہ میں اپنے باپ کی طرح بدنام نہ تھا۔

محمد حسن کی شادی بہت قبل ہو چکی ہوتی مگر خانصاحب چونکہ قصبہ میں کسی کو اپنے برابر نہ جانتے تھے اس لیے اس کی نوبت نہ آئی تاہم وہ چیز جسے شباب کہتے ہیں ان رسمی قیود سے بالاتر ہے۔ خانصاحب کا خواہ کچھ ہی خیال ہو لیکن محمد حسن اپنے دل میں ایک تصویر قایم کئے ہوئے تھا یہ تصویر اب کی نہیں بلکہ اب سے برسوں پہلے دل میں جگہ پا چکی تھی جبکہ محمد حسن جمنا کے گھڑے میں غلے مارا کرتا تھا اور جمنا کوسا کرتی تھی۔

امتداد زمانہ کے ساتھ محمد حسن کے دل میں جمنا کی جس قدر محبت بڑھتی رہی اسی قدر تکلف بھی زیادہ ہوتا گیا یہاں تک کہ چند سال سے دونوں گویا ایک دوسرے سے واقف نہیں تھے۔

محبت کی زندگی کبھی یکساں نہیں رہتی، محمد حسن نے پہلے تو کافی زمانہ راضی بہ رضا نہایت صبر و سکون سے گزار دیا لیکن جب ردِ عمل شروع ہوا تو اس نے کوئی جایز ذریعہ حصول مقصد کے لئے نہ چھوڑا مگر اس کی تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ محمد حسن خود شیر افگن تھا اور شیر گیر کا لڑکا بھی اور اثر کا یہ عالم کہ گاؤں کا کوئی فرد نہ تھا جو اس سے لرزہ براندام نہو۔ مور مارنے کی سزا چودہ سال قید مقرر تھی لیکن وہ روزانہ شکار کرتا تھا، منڈ و مسجد سے کبوتر مار لینا تو معمولی بات تھی مگر خدا جانے جمنا میں وہ کونسی طاقت تھی کہ محمد حسن جیسا شخص اس کو دیکھ کر ایسا کھو جاتا تھا کہ جمنا کو نظر بھر کر دیکھ بھی نہ سکتا تھا۔ گاؤں کے پہلو میں سپرا ندی بہتی تھی اور یہی گاؤں والوں کے لئے ذریعۂ حیات تھی، صبح شام گاؤں کی عورتیں پانی بھرنے اس کے کنارے جمع ہوتی تھیں اور اپنے گھڑے بھرنے سے پہلے آپس میں خوب باتیں کرتیں، گاؤں بھر کے قضیئے زیر بحث آتے فصل پر رائے زنی ہوتی۔ زیور کی کثرت اور قلت پر تنقید ہوتی پانی اُچھالا جاتا اور لمبی لمبی تانوں سے گایا جاتا۔

محمد حسن گو جانتا تھا کہ وہ جمنا کو ندی کے کنارے دیکھ سکتا ہے لیکن اس خوف سے کہ مبادا جمنا کو برا معلوم ہو وہ کبھی ندی کے کنارے نہیں گیا۔ چند دن تک تو یہی حالت رہی لیکن محمد حسن بہت روز صبر نہ کر سکا اور اسکا معمول ہو گیا کہ وہ جھاڑیوں میں چھپ کر جمنا کو دیکھنے لگا جسوقت وہ جمنا کو دوسری لڑکیوں کے ساتھ کھیل میں مصروف دیکھتا تو اس کا بے اختیار جی چاہتا کہ خود ان کے کھیل میں شریک ہو جائے یا جمنا کے سوا سب کو گولی مار دے، کئی مرتبہ اس کے دل میں یہ آرزو بھی پیدا ہوئی کہ اے کاش یہ ممکن ہوتا کہ میں جب چاہتا عورت اور جب چاہتا مرد بن جاتا۔

زمانہ گزرتا رہا اور محمد حسن نے کوئی بات اپنی طرف سے ایسی نہ ہونے دی کہ جمنا کو کوئی شکایت پیدا ہو لیکن جب کبھی راہ میں جمنا کا سامنا ہو جاتا تو ایک نظر کے بعد کوئی کسی کو دیکھنے کی کوشش نہ کرتا۔

برسات کا زمانہ تھا گاؤں میں بہار تھی۔ پانی روزانہ برس رہا تھا سپرا ندی اپنے دونوں کناروں سے اُبلی ہوئی تھی، برسات میں ملہار اور ساون کی تانیں فرائض مذہبی میں داخل ہیں گاؤں کی عورتیں دریا پر آتے جاتے برابر گایا کرتیں۔

ایک دن شام کو کچھ جھٹ پٹا سا ہو رہا تھا کہ جمنا چند لڑکیوں کے ساتھ ندی پر آئی سب نے اپنے اپنے گگرے بھرے جمنا نے جسوقت گگرا ندی میں ڈالا ساتھ والی لڑکی نے اس سے کچھ کہا وہ اس طرف متوجہ ہوئی ادھر گگرا ہاتھ سے چھوٹ گیا، جمنا یہ سمجھ کر کہ پانی تھوڑا ہے آگے بڑھی آگے قدم بڑھانا تھا کہ دفعتاً پانی میں غرق ہو گئی، جمنا نے ابھر کر سنبھلنا چاہا کہ ایک بڑی موج نے کنارے سے اس کو دور پھینک دیا لڑکیوں میں کھلبلی مچ گئی اور "بچاؤ بچاؤ" کا شور بلند ہوا محمد حسن نے اپنا معمول نہ چھوڑا تھا جھاڑی سے نکل کر معہ کپڑوں کے ندی میں کود پڑا جمنا اب تک دو غوطے کھا چکی تھی تیسری مرتبہ وہ ابھری تھی کہ محمد حسن پہونچ گیا اور بے جان لاش کی طرح پیٹھ پر لاد کر کنارے ڈالدیا جمنا بالکل بے ہوش تھی وہ اس کو اسی حالت میں چھوڑ کر وہاں سے چلدیا۔

(۳)

جب خانصاحب کو جمنا کے ڈوبنے اور محمد حسن کے بچانے کا علم ہوا تو انھوں نے اس کو اچھا نہ سمجھا کیونکہ جب مذہبی تقشف حدود سے متجاوز ہو جائے تو انسان اپنے عقاید کے خلاف کسی کو دیکھنا نہیں چاہتا یہی وجہ ہے کہ مذہبی آدمیوں میں جذبات رحم و کرم نہیں رہتے۔ آج پہلا موقعہ تھا کہ گاؤں والوں نے باوجود اپنی بیزاری کے محمد حسن کی جرأت و ہمت کی تعریف کی۔ بلدیو جمنا کے بوڑھے باپ کی زبان دعائیں دیتے دیتے خشک ہو رہی تھی جب وہ محمد حسن کے پاس شکریہ ادا کرنے آیا تو جوش تشکر نے اس کی زبان بند کر دی تھی، ہزار خوشامدیں کر کے اپنے گھر لے گیا اپنی حیثیت کے مطابق خدمت کی جمنا آج دوڑ دوڑ کر کام کر رہی تھی جب بلدیو نے یہ کہا کہ "بھیا یہ آج سے آپ کی بہن ہے میں تو غلام ہوں جو چاہو خدمت لو" تو محمد حسن کی یہ حالت تھی کہ دل اندر سے امنڈا آتا تھا اور اس کا جی چاہتا تھا کہ بلدیو کے قدموں میں گر کر اپنا حال کہدے لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔

آہستہ آہستہ محمد حسن کی آمد و رفت بلدیو کے گھر بہت بڑھ گئی لیکن جمنا سے گفتگو کا اس کو کبھی موقعہ نہ ملا، ممکن ہے خود اس نے کبھی ایسا موقعہ نہ آنے دیا ہو لیکن بے تاب نظریں اور تڑپنے والا دل ایسی چیزیں نہیں کہ ان کا اثر نہ ہو دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے اور دل ہی دل میں گھٹتے رہتے تھے۔

دل کی آگ جب مشتعل ہو جاتی ہے تو ہر چیز کو خس و خاشاک کی طرح پھونک دیتی ہے چنانچہ محمد حسن بہت جلد اس زندگی سے بیزار ہو گیا کیونکہ وہ جمنا کے سامنے بے اختیار ہو جاتا تھا اور وہ بے اختیار ہونا چاہتا نہ تھا۔ محبت میں خود اعتمادی کا خیال ہمیشہ غلط ہوتا ہے اور انسان بہت جلد اپنی غلطی محسوس کر لیتا ہے محمد حسن نے اکتا کر اور یہ خیال کر کے کہ جب پاس رہنے میں بھی وہی اذیت ہے جو دور رہنے میں ہے، جمنا کے گھر جانا بند کر دیا، اس کا خیال تھا کہ اس طرح سکون حاصل ہو جائے گا لیکن بہت جلد اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اپنے فیصلہ پر افسوس کرنے لگا وہ کام میں مصروف ہو گیا کہ جمنا کا خیال اس کو نہ ستائے مگر وہ جسقدر اس کے خیال کو دور کرتا تھا اسی قدر جمنا اسکے دل و دماغ پر

زیادہ مستولی ہوتی جاتی تھی، اس کا دل چاہتا تھا کہ پھر وہی ہنستی ہوئی آنکھیں اور روشن چہرہ سامنے ہو لیکن یہ منظر اب کہاں اگرچہ بلدیو نے کئی مرتبہ خود آکر وجہ پوچھی اور لے جانا چاہا مگر محمد حسن نے انکار کر دیا کیونکہ وہ اس میں اپنی ہتک محسوس کرتا تھا کہ وہ چند روز بھی اپنے عزم پر قایم نہ رہ سکے۔

جمنا اپنے دل میں اس تغیر پر حیران تھی اس کا جی چاہتا تھا کہ خود محمد حسن کے گھر جا کر اس سے وجہ دریافت کرے۔ لیکن خانصاحب کے خوف سے وہ ایسا نہ کر سکی۔

جب تک محمد حسن کی آمد و رفت جمنا کے گھر رہی جمنا اپنے قلب کی گہرائیوں میں ایک مبہم مسرت کے سوا کچھ اور نہ محسوس کر سکی مگر جب محمد حسن نے آنا بند کر دیا تو اس کو معلوم ہوا کہ اس کی زندگی سے کوئی لطیف شے نکال لی گئی ہے اور اس نے زندگی میں ایک خلا پیدا کر دیا ہے۔

ایک دن جمنا پانی بھر کے گھر واپس جا رہی تھی کہ راستہ میں محمد حسن کا سامنا ہو گیا۔ محمد حسن نے تو آنکھ بچا کر گزرنا چاہا مگر جمنا راستہ روک کر سامنے کھڑی ہو گئی کچھ دیر تو دونوں طرف خاموشی رہی جمنا اسوقت مناسب الفاظ تلاش کر رہی تھی لیکن دائمی اضطراب کی وجہ سے خیالات کہیں سے کہیں لے جا رہے تھے آخر اس نے جی کڑا کر کے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا کہ "آپ نے آنا کیوں بند کر دیا"، محمد حسن کا سانس پھول رہا تھا اس کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا وجود فضا میں تحلیل ہو چکا ہے اور جمنا کی آواز دنیا کے کسی بعید گوشہ سے اس کے کان میں آ رہی ہے جب جمنا نے کئی مرتبہ اپنا سوال دہرایا تو اس کو ہوش آیا گھبرا کر کہدیا کہ "آج کل کام زیادہ ہے اس لئے نہ آسکا"۔ اس پر جمنا نے کہا کہ "یہ بات نہیں میں تو کچھ اور ہی بات پوچھتی ہوں"، محمد حسن کا جی چاہتا تھا کہ آج وہ سب کچھ کہدے جس کے کہنے کی تمنا پر وہ زندہ تھا چنانچہ اس نے کافی تردد کے بعد یہ کہہ ہی دیا کہ جمنا اگر تمھارے پاس آنکھیں نہ ہوتیں اگر تمھارے پاس دل نہ ہوتا تو میں یقین کر لیتا کہ تم بے خبر ہو لیکن جب ایسا نہیں ہے تو بتاؤ کہ اپنے نہ آنے کی کیا وجہ بیان کروں اگر میں یہ کہوں کہ تم کچھ کو خود آنے سے روکتی ہو تو تم یقین نہ کرو گی لیکن یہ واقعہ ہے میں نے بہت چاہا کہ اپنی حالت کو تم پر ظاہر نہ کروں مگر جب تم خود دریافت کرو تو پھر بتاؤ کہ میں کیا کروں اگر کسی کو عزیز رکھنا جرم ہے تو میں مجرم ہوں لیکن دنیا والے کبھی رحم نہیں کرتے پھر کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میرا جنون تم کو بدنام کر دے اس لئے میں کبھی نہ آؤں گا اگر خدا نے مجھ کو ہمت دی"۔ یہ کہکر محمد حسن نظروں سے غائب ہو گیا جمنا نے گھڑے کو ایک پتھر پر رکھ دیا تھا خود بھی اسی پر بیٹھ کر غور کرنے لگی اور تھوڑی دیر کے بعد ایک لمبا سانس لیکر اٹھی اور گگرا لیکر اپنے گھر روانہ ہو گئی۔

(۴)

محبت میں ناکامی انسان کو اکثر دو طرف متوجہ کرتی ہے۔ اگر اتفاقی ناکامی ہوئی ہے تو خودکشی کا خیال آتا ہے ورنہ ترک سکونت کا چنانچہ محمد حسن کے دماغ میں بھی یہ خیال راسخ ہو گیا کہ اگر مجھے سکون نصیب ہو سکتا ہے تو چوسی سے دور رہ کر۔ چنانچہ اس نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ "جامعہ ملیہ جا کر پڑھنا چاہئے۔ لیکن جب اس نے اس کی اطلاع والدین کو دی

تو انھوں نے اس کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ جب اللہ کے فضل سے گھر میں کھانے کو موجود ہے تو پھر علم حاصل کرنے کی کیا ضرورت ہے مگر محمد حسن اپنی بات پر ایسا اڑا کہ مجبوراً اجازت دینا ہی پڑی۔

جانے سے کچھ دیر پہلے محمد حسن جمنا کے ہاں گیا اتفاق سے بلدیو کھیت پر گیا ہوا تھا محمد حسن نے لوٹ آنے کا ارادہ کیا تھا کہ جمنا نے روک لیا اس نے اپنے جانے کی اطلاع دی، جمنا پریشان ہوگئی اور ایسی گھبرائی کہ محمد حسن بیتاب ہوگیا اس نے کہا "جمنا تم پریشان کیوں ہوتی ہو میں نہ معلوم کس طرح ابتک یہاں رہا اب برداشت کی طاقت نہیں دل و دماغ چھلنی ہوگئے، مجھے اپنی پرواہ نہیں لیکن نہ معلوم میں اپنی دیوانگی میں کیا کر گزروں اور تمھارے لئے میری دیوانگی باعث بدنامی ہو کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ میری حالت روز بروز نازک ہوتی جاتی ہے اس لئے میں نے یہی مناسب جانا کہ کچھ روز کے لئے یہاں سے چلا جاؤں تم افسوس نہ کرنا میں جلد آنے کی کوشش کروں گا"

اس اتفاقی ملاقات کے بعد محمد حسن کا دل نہ چاہتا تھا کہ چوسی سے باہر جائے لیکن وہ جو عزم کر چکا تھا اُس سے پھرنے میں بھی اُس کو اپنی ذلت محسوس ہوتی تھی آخر جس طرح بنا وہ دہلی روانہ ہوگیا۔

(۵)

محمد حسن کو دہلی گئے چھ برس ہوگئے اس دوران میں وہ کبھی ایک دن کے لئے بھی چوسی نہیں آیا۔ خانصاحب پریشان تھے اور برابر اس کو بلاتے رہتے تھے لیکن وہ کسی نہ کسی بہانے ٹال دیتا تھا، اس دوران میں خانصاحب کا کاروبار بہت ترقی کر گیا اب ان کا ایک روئی کا کارخانہ اور ایک آٹے کی چکی چل رہی تھی اور ارد گرد کا کوئی ایسا گاؤں نہیں تھا جو ان کا مقروض نہو قرضہ میں بہت سی جائدادیں خانصاحب کے قبضہ میں آگئیں۔ گیہوں کی فصل کا زمانہ ہے چوسی اور متعلقہ گاؤں میں کہرام مچا ہوا ہے کھڑی فصلیں قرق ہو رہی ہیں کھلیانوں سے غلہ خانصاحب کے کوٹھوں میں جمع ہو رہا ہے جنھوں نے سال بھر محنت کی وہ آج سر پر ہاتھ رکھ کر رو رہے ہیں کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ دو چار گاؤں والے رقم کی عدم ادائی پر جوتے نہ کھاتے ہوں نہایت سخت جذبۂ نفرت خانصاحب کے خلاف پھیلا ہوا ہے لیکن کسی میں اتنی طاقت نہیں کہ خانصاحب کا مقابلہ کرے بہت سے گھر بار چھوڑ کر علاقۂ غیر میں جا بسے جو باقی ہیں وہ فاقوں مر رہے ہیں تمام علاقہ میں تباہی پھیلی ہوئی ہے، یوں دیکھا جائے تو اب کے چوسی میں اسوقت کے چوسی سے بہت فرق ہے دولوں نے کاروبار کو بہت ترقی دیدی ہے مگر ایک چیز ایسی پیدا ہوگئی ہے جو اسوقت نہ تھی اسوقت چوسی میں کوئی مزدور نہ تھا اور آج سوائے مزدور کے کوئی کاشتکار نہیں غریبوں کے گھر بھی سود در سود کی نذر ہو چکے ہیں اور کرایہ پر رہتے پھرتے ہیں۔

دولت کی ترقی کے ساتھ خانصاحب کا مذہبی انہماک بھی ترقی کر گیا ہے پہلے صرف نماز پڑھنے کا شوق تھا اور اب نماز پڑھانے میں ان کو بہت مزا آنے لگا ہے نہایت قرأت کے ساتھ لمبی لمبی صورتیں نماز میں پڑھتے ہیں اور بعد نماز حقوق العباد خدا کے رحم و کرم اور آنحضور کے جذبۂ رافت و نرمی پر وعظ فرماتے ہیں صبح کو گھر پر تلاوت قرآن کے ساتھ اپنے مقروضوں کو

گالیاں بھی اسی زور شور کے ساتھ دیتے جاتے ہیں اکثر جاہلوں کو علم حاصل کرنے کی ترغیب دیتے ہیں اور اس میں اپنے بیٹے کا ذکر نہایت فخر کے ساتھ کرتے ہیں۔

جمنا کی شادی کو تین برس ہونے کو آئے اب وہ یہاں سے بہت دور اپنی سسرال میں رہتی ہے اور جب کبھی اپنے میکے آتی ہے تو محمد حسن کے متعلق ضرور دریافت کرتی ہے۔ جمنا کی شادی کے وقت بلدیو نے جو روپیہ خانصاحب سے قرض لیا تھا وہ کسی طرح ادا نہ ہوا اگرچہ سود میں اصل رقم کے برابر وہ روپیہ ادا کر چکا ہے۔ جب خانصاحب کے تقاضے اور گالیوں کے باوجود بلدیو رقم ادا نہ کر سکا تو خانصاحب نے ڈگری جاری کرا کے مکان اور بیل نیلام کرا لئے روپیہ کی قلت اور ضعف کی وجہ سے اس نے خانصاحب کی نوکری اختیار کر لی اور اپنے کھیتوں پر خانصاحب کے ملازم کے طور پر کام کرنے لگا جب وہ اپنے کھیتوں پر ملازم کی حیثیت سے کام کرنے جاتا تو پہلے مینڈ پر بیٹھ کر روتا اور محمد حسن کو یاد کرتا، اس کا خیال تھا کہ وہ اگر یہاں موجود ہوتے تو ضرور اس کی مدد کرتے اگر کسی دن کام میں کوئی خرابی ہو جاتی تو وہ خانصاحب کی گالیاں اور ان کے ملازموں کی مار برداشت کرتا بلدیو اسوقت زبان سے کچھ نہ کہتا لیکن پرماتما کے انصاف پر ضرور مسکرا دیتا۔

فصل کا زمانہ وصولی کا ہوتا ہے۔ اتفاقاً مصری پور کا زمیندار جو کسی زمانہ میں خوش حال تھا لیکن اب خانصاحب کے قرض سے اس کا بال بال جکڑا ہوا تھا، چوتھی میں رات کو ایک شادی میں آیا خانصاحب کے ملازم بہت دنوں سے اس کی تلاش میں تھے انھوں نے خانصاحب کو اس کی اطلاع دی، وہ کچھ آدمیوں کو لیکر شادی میں پہونچے زمیندار کو دیکھ کر آپے سے باہر ہو گئے سیکڑوں گالیاں دیں اور اپنے آدمیوں سے کہا کہ لگاؤ اس کے جوتے، لوگوں نے خوشامد بھی کی لیکن خانصاحب نے ایک نہ سنی اور زمیندار کو خوب ذلیل کر کے اور روپیہ کی ضمانت لیکر لوٹے، زمیندار اپنی یہ ذلت دیکھ کر روتا ہوا بارات سے رخصت ہو گیا اس واقعہ کے پندرہ روز بعد رات کو بارہ بجے کے قریب قصبہ میں شور ہوا کہ خانصاحب کے مکان میں آگ لگی ہے اگرچہ خطرہ تھا کہ آگ کہیں سارے گاؤں کو نہ پھونک دے لیکن اہل قصبہ کو جو قلبی تنفر خانصاحب سے تھا اس نے کسی کو خانصاحب کی مدد پر آمادہ نہ کیا بلکہ لوگ گھروں سے بھی نہ نکلے آگ نے بہت جلد خوفناک صورت اختیار کر لی اور خانصاحب کا مکان شعلہ زار بن گیا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مکان کے چاروں طرف بیک وقت آگ لگی ہے خانصاحب نے بیدار ہو کر باہر بھاگنا چاہا لیکن دروازہ پر پہونچکر معلوم ہوا کہ باہر سے زنجیر بند ہے سیکڑوں آوازیں دیں لیکن کسی نے دروازہ نہ کھولا باہر جانے کا صرف ایک ذریعہ رہگیا تھا مکان کے تین طرف عمارت تھی اور ایک طرف بہت اونچی دیوار تھی، خانصاحب کوئی مفر نہ دیکھ کر دیوار پر چڑھ گئے اور مدد کے لئے آوازیں دیں لیکن صدائے برنہ خواست اگرچہ نیچے کود نا موت کے منھ میں جانا تھا لیکن اس کے سوا اور چارہ بھی نہ تھا دوسرے خانصاحب کے دماغ کو عورتوں اور بچوں کی چیخوں نے اس قدر

ازخود رفتہ کر دیا کہ دیوار سے کود پڑے، تیس فٹ کی بلندی سے پتھر کی ایک چٹان پر گرے اور دماغ پاش پاش ہوگیا۔
بلدیو خانصاحب کی دوکان پر سو رہا تھا جب اس نے شور وغل کی آوازیں سنیں تو بھاگا ہوا مکان پر پہونچا اندر کہرام مچا ہوا تھا اُس نے چاہا کہ مکان کا دروازہ کھولدے زنجیر کو ہاتھ لگایا تھا کہ کسی نے پیچھے سے اس زور سے لٹھ مارا کہ بلدیو بے ہوش ہوکر گر پڑا لیکن وہ زنجیر کھول چکا تھا، زنجیر کھلتے ہی عورتیں اور بچے باہر آگئے لیکن ان کے جسم جھلسے ہوئے تھے اور باہر آتے ہی اکثر ان میں سے بے ہوش ہوگئے ۔ صبح کو پولیس نے تحقیقات شروع کی اور مجروحین کو قریب کے شفاخانہ بھیجا دوکان پر قفل ڈالدیا اور محمد حسن کو تار دیا۔

(۶)

ان واقعات کو دو سال کا زمانہ گزر گیا ہے۔ محمد حسن کا کاروبار اب سود پر نہیں چلتا، جن پر خانصاحب کا قرض تھا ان سے سود معاف کرکے اصل رقم لی اور جو سود میں کچھ رقم دے چکے تھے اس کو اصل میں شامل کرکے بقیہ رقم وصول کی، یا تو یہ حالت تھی کہ گاؤں والے اس گھر سے پناہ مانگتے تھے یا محمد حسن کے طرز عمل سے ایسے خوش ہوئے کہ گاؤں کے تمام جھگڑے اسی کے ذریعہ سے طے ہونے لگے۔ جسوقت دیکھو گاؤں والے اس کے گرد جمع ہیں جب وہ کسی راستہ سے نکل جاتا تو لوگ کھڑے ہوکر سلام کرتے اور جب کہیں جاتے تو اس کی بھلائی کی تعریفیں اپنے ساتھ لئے جاتے۔ وہ قرض اب بھی دیتا تھا لیکن اس کی وصولی کے لئے کبھی اس کو گالیوں اور لٹھ کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی، نماز وہ بھی پڑھتا تھا اور بڑی جماعت کے ساتھ مگر کبھی اس کو نماز میں آنے کے لئے دھمکانے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ بلدیو اب محمد حسن کا نوکر نہیں بلکہ معتمد خاص تھا گھر کا سارا کاروبار اسی کے ہاتھ میں تھا اس کا مکان اس کو واپس مل چکا تھا اور وہ ہر طرح خوش تھا جمنا کئی برس سے میکے نہیں آئی تھی بلدیو اکثر چاہتا تھا کہ جاکر لائے لیکن کوئی نہ کوئی کام ایسا نکل آتا کہ اس کا جانا ملتوی ہوجاتا محمد حسن باوجود اس مصروفیت اور سکون کے کچھ کھویا سا رہتا ماں نے کئی بار شادی کرنے کو کہا لیکن اس نے ٹال دیا اسی طرح زمانہ گزرتا رہا، سردی کا موسم تھا بلدیو کو کھیت پر سردی لگ گئی اور گھر پہونچتے پہونچتے اچھا خاصا بخار ہوگیا رات بھر بے ہوش رہا صبح محمد حسن کو خبر ہوئی وہ فوراً پہونچا اور علاج کی فکر کی، بیماری کے ۱۵-۲۰ دن بعد بخار ہلکا ہونا شروع ہوا اب سب کو یقین ہونے لگا کہ بلدیو اچھا ہوجائے گا۔ ایک روز صبح کو محمد حسن بلدیو کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا کہ بلدیو کے نام جمنا کی سسرال سے ایک خط آیا محمد حسن نے پڑھا تو بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، جب بلدیو کو اس کی خبر کی کہ جمنا رانڈ ہوگئی ہے تو وہ فرطِ غم سے بے ہوش ہوگیا، بہت دیر بعد جب اسکو ہوش آیا تو اس کی حالت پھر متغیر ہوگئی اور بیماری عود کر آئی محمد حسن نے اُس کو سکون دینے کی بہت کوشش کی لیکن اس کا اضطراب بڑھتا ہی گیا وہ بار بار کہتا کہ میاں جمنا کو بلوالو وہاں نہ معلوم اس کا کیا حال ہوگا مجبور ہوکر محمد حسن نے اپنے بڑھے منیب کو جمنا کے لینے کے لئے روانہ کیا۔ چھٹے دن جب جمنا پہونچی تو محمد حسن خود گاڑی لیکر اسٹیشن پہونچا

جب جمنا کی نظر محمد حسن پر پڑی تو اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے محمد حسن کی حالت موقتہ خود خراب تھی لیکن جس طرح ممکن ہوا اپنی بھرائی ہوئی آواز میں تسکین دی۔

جب محمد حسن اور جمنا بلدیو کے پاس پہونچے تو وہ بے چینی سے جمنا کا انتظار کر رہا تھا جمنا کو دیکھ کر وہ اسقدر رویا کہ اس کی حالت خراب ہو گئی جب کچھ سکون ہوا تو اس نے ایک نظر دونوں پر ڈالی اور غمگین آواز میں کہا کہ:- "میاں آپ نے ایک بار جمنا کو مرنے سے بچایا تھا آج پھر یہ ڈوبنے کے قریب ہے میری زندگی اب چند گھنٹے سے زیادہ نہیں۔ آپ پریشان نہوں میں اپنی حالت خوب جانتا ہوں۔ اس کا اب آپ کے سوا دنیا میں کوئی نہیں۔ آپ ہی دنیا میں اس کا سہارا ہیں۔ اگر میرے بعد اس کو تکلیف پہونچی تو مجھ کو مر کر بھی چین نہ لینگا۔ لائیے میں آپ کے ہاتھ میں جمنا کا ہاتھ دے جاؤں تاکہ میں سکون سے مر سکوں"۔ یہ کہہ کر جمنا کا ہاتھ بلدیو نے محمد حسن کے ہاتھ میں دیدیا اور ایسی آنکھیں بند کیں کہ پھر نہ کھولیں۔

محمد ذوالفقار کیفی منشی فاضل

مکتوبات نیاز

ادب و انشاء کی دنیا میں وہ چیز جس کی مثال آج کی اردو زبان میں مل ہی نہیں سکتی۔ طنزیات و مضاکات، شوخی و رنگینی سلاست و بیساختہ پن، لطیف و پاکیزہ اشعار کا محل استعمال، جذبات کی پاکیزگی، طرز ادا کی ندرت، اگر آپ ان تمام خوبیوں کو یکجا دیکھنا چاہتے ہیں تو وہ آپ کو صرف "مکتوبات نیاز" میں نظر آئیں گی۔ اس میں حضرت نیاز کی تازہ تصویر بھی شامل ہے اور ان کی تحریر کا بلاک بھی۔ ضخامت ۲۸۸ صفحات، کاغذ دبیز۔ قیمت معہ محصول ۱۴ عہ
کتاب مجلد شائع ہوئی ہے۔
منیجر نگار۔ لکھنؤ

تذکرۂ معرکۂ سخن

یہ تذکرہ اردو زبان میں اپنی نوعیت کا صرف پہلا تذکرہ ہے جس میں زمانۂ قدیم سے لیکر موجودہ عہد تک کے تمام مشہور شعراء فارسی و اردو کے کلام پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں معہ جواب و محاکمہ یکجا کر دئے گئے ہیں، فن شعر و انشاء کے شائقین کے لئے عجیب چیز ہے۔ قیمت معہ محصول ۸ عہ
منیجر نگار۔ لکھنؤ

خودکشی

(نفسیاتی روشنی میں)

متمدن ممالک میں اعداد و شمار فراہم کرنے اور ان کو دیکھ کر کسی خاص نتیجہ تک پہونچنے کی بڑی کاوش کی جاتی ہے چنانچہ وہاں واقعات خودکشی کی فہرستیں بھی وقتاً فوقتاً شایع ہوتی رہتی ہے اور یہ سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ خاص سبب کیا ہے جو تمام خودکشی کرنے والوں میں یکساں طور پر پایا جاتا ہے۔

بیمہ کمپنی والوں نے جو اعداد و شمار پیش کئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ظاہر اسباب کو دیکھ کر کبھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ایک شخص خودکشی کرسکتا ہے یا نہیں کرسکتا ہے، کیونکہ خودکشی کرنے والوں میں جتنی تعداد مفلس و بیمار، ناکام و مایوس لوگوں کی پائی جاتی ہے اتنی ہی بلکہ اس سے زیادہ امیر و تندرست، کامیاب و خوشحال لوگوں میں بھی نظر آتی ہے۔ چنانچہ فہرست اعداد و شمار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ جنگ سے زیادہ زمانۂ امن میں، بیماری سے زیادہ صحت کی حالت میں اور غریبوں سے زیادہ خوشحال لوگوں میں خودکشی کی تعداد زیادہ پائی جاتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اسکا تعلق جہل و وحشت سے ہے تو بھی درست نہ ہوگا کیونکہ خودکشی کے واقعات شایستہ ممالک اور تعلیم یافتہ لوگوں میں بہ نسبت غیر مہذب ممالک اور جاہل انسانوں کے زیادہ پائے جاتے ہیں۔

تحقیق کرنے والوں نے ہر چند جسمانی حالات کے لحاظ سے خودکشی کے اسباب پر غور کیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس جذبہ کا تعلق ایک خاص دماغی ردعمل سے ہے جس پر نفسیاتی نقطۂ نظر سے غور کرنا زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے اس امر کا ثبوت کہ یہ کسی خاص اندرونی جذبہ سے متعلق ہے اس سے بھی ملسکتا ہے کہ وہ لوگ جو مذہب کے سختی سے پابند ہیں ان میں خودکشی کے واقعات بہت کم پائے جاتے ہیں، کیونکہ مذہب اس کو گناہ قرار دیتا ہے جس کی سزا مرنے کے بعد بھی ملے گی اور سزا کا خیال یا محض احکام مذہبی کی پابندی کا احساس اس جذبہ یا نفسیاتی کیفیت کو ضعیف کردیتا ہے جو خودکشی کا سبب ہوا کرتی ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جذبۂ خودکشی ایک نوع کا جنون ہے، دیوانگی ہے لیکن ایسا کہنا درست نہیں

کیونکہ یہ صحیح ہو تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ پاگل خانوں میں خودکشی کے واقعات زیادہ پائے جائیں، حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔ اسی لئے عورتوں اور مردوں کی نسبت کے لحاظ سے اس مسئلہ پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ دیوانگی یا جنون کے باب میں مرد و عورت کی نسبت برابر کی ہے لیکن پاگل عورتوں کی بہ نسبت پاگل مردوں میں خودکشی کے واقعات چہار چند زیادہ پائے جاتے ہیں۔ الغرض جنون و دیوانگی کو خودکشی کا سبب قرار دینا کسی طرح درست نہیں معلوم ہوتا۔

اب افلاس و غربت کو لیجئے تو معلوم ہوگا کہ کروڑوں انسان دنیا میں اس وقت ایسے موجود ہیں جو حد درجہ تنگی و عسرت میں زندگی بسر کر رہے ہیں لیکن شاید ہی ہزار دو ہزار میں کسی کو خودکشی کا خیال پیدا ہوتا ہو اگر افلاس ہی اس کا واقعی سبب ہو سکتا ہے تو چاہیئے کہ مریضوں میں سے اکثر لوگ خودکشی کر لیا کریں حالانکہ ایسا نہیں ہوتا اور اسپتالوں میں خودکشی کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔

بعض کا خیال ہے کہ جنگ بھی ایک سبب خودکشی کا ہوا کرتی ہے لیکن تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کے دوران میں بہت کم واقعات خودکشی کے رونما ہوتے ہیں چنانچہ امریکہ کے دو سالہ جنگ کے زمانہ میں خودکشی کی تعداد پچھلے پانچ سال سے بھی کم تھی۔

ماہرین نے یہ بھی غور کیا ہے کہ کیا سیاسی آزادی خودکشی کا باعث ہو سکتی ہے یا نہیں۔ اس کا تعلق بھی اس مسئلہ سے نہیں ہے، کیونکہ اب مغرب میں بہ نسبت پہلے کے زیادہ سیاسی آزادی پائی جاتی ہے لیکن خودکشی کے واقعات بھی اسی کے ساتھ بڑھ گئے ہیں۔

اب رہ گیا سوال موسم کا، سو یہ بھی بالکل غیر متعلق نظر آتا ہے، کیونکہ جاڑے کے مغربی ممالک جہاں سردی و برف کا زمانہ موسم بہار سمجھا جاتا ہے خودکشی کے واقعات بہ نسبت ایام سرما کے زیادہ پائے جاتے ہیں۔ الغرض جنون، بیماری افلاس و خرابی موسم وغیرہ سے جذبۂ خودکشی بالکل غیر متعلق معلوم ہوتا ہے اور یقیناً اس کا تعلق ایک خاص میلان نفسی سے ہے جسے جذبۂ انانیت[1] (Egoism) کہتے ہیں۔ ایک خاص پندار و عزم کے ساتھ کسی مقصد کے حصول کی کوشش کرنا اور پھر اس میں ناکام رہنا یا کامیابی کے بعد اس پر قایم نہ رہ سکنا بعض جذبۂ انانیت رکھنے والوں کو حد درجہ متاثر کرتا ہے اور وہ شکست کے مقابلہ میں موت کو ترجیح دینے لگتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ خودکشی کرنے والا اپنی جان دیکر ایک طرح اپنی شکست کا اعتراف کرتا ہے لیکن اسی کے ساتھ وہ ایک جذبۂ خودمندی بھی رکھتا ہے یعنی یہ کہ اس نے اپنے دشمنوں کو عرصہ تک اپنی ذلت و ناکامی پر سرور ہونے کا موقع نہیں دیا۔ خودکشی کرنے والے کی نگاہ میں ساری دنیا اور خصوصیت کے ساتھ اس کا وہ حصہ جو اس کی ذلت و ناکامی کا

---

[1] اُردو میں یہ لفظ بُرے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن یہاں "خودپرستی" کے اصطلاحی مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔

ذمہ دار ہے، اس کا دشمن ہوتا ہے اور اس لئے وہ یہ پسند نہیں کرتا کہ اس کا دشمن اس کی مغلوبیت پر خوش ہو، چنانچہ وہ خودکشی کرکے اپنے نزدیک خود ایک نوع کی فتح اپنے دشمن پر حاصل کر لیتا ہے۔

اعداد و شمار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ میں زیادہ تعداد میں خودکشی کرنے والے وہ ہوتے ہیں جو کاروبار میں ایک دفعہ کامیابی حاصل کرنے کے بعد دفعتاً ناکام ہو جاتے ہیں۔ پھر ظاہر ہے کہ ان لوگوں کے سامنے سوال فقر و فاقہ کا نہیں ہوتا بلکہ اس غرور نفس کے ٹوٹنے کا ہوتا ہے جو سوسائٹی میں انھیں سربلند رکھتا تھا اور اس سے ان کے دل و دماغ کو اتنا صدمہ پہونچتا ہے کہ وہ اس کو برداشت نہیں کر سکتے اور صرف اس لئے کہ دشمن عرصہ تک ان کو مغلوب حالت میں دیکھ کر مسرور نہ ہو سکیں وہ اپنی جان کھو دیتے ہیں۔

رسل فرنیز نے خودکشی کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ:۔ مغرب کے کسی چھوٹے سے شہر میں ایک شخص نے آہستہ آہستہ غیر معمولی تجارتی کامیابی حاصل کر لی اور اسی کے ساتھ اس کا اقتدار بہت بڑھ گیا یہاں تک کہ ہر شخص اس کو اپنا حاکم و سردار سمجھنے لگا۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں ایک اور تاجر پیدا ہوا جس نے رفتہ رفتہ اس کو شکست دینا شروع کی اور حالات بالکل بدل گئے یعنی تمام وہ عزت جو کسی وقت اس کو حاصل تھی، اس نئے نوجوان تاجر نے چھین لی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوب تاجر نے خودکشی کر لی۔ آپ سمجھے کہ وہ کونسا نفسیاتی ردعمل تھا جو اس کا محرک ہوا۔

اس نے سوچا ہوگا کہ یہ میری تمام عمر کی محنت و جانفشانی کا نتیجہ جو یوں خاک میں مل رہا ہے تو اب دو ہی صورتیں ہیں یا یہ کہ میں اپنی اس شکست کو تسلیم کرکے ذلیل زندگی بسر کرنا منظور کروں اور دشمن کی فتحمندی کے مناظر دیکھ دیکھ کر خون کے گھونٹ پیتا رہوں یا یہ کہ خودکشی کرکے اس تمام جھگڑے کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دوں۔ چنانچہ اس نے دوسری صورت کو ترجیح دی اور اپنی جان دیدی۔

ایک غیور شخص کے لئے اس سے زیادہ تکلیف دہ امر کوئی نہیں کہ وہ فریق ثانی سے مغلوب ہونے کے بعد اپنی مغلوبیت اور دشمن کی فتحمندی کو دیکھتے رہنے کے لئے زندہ رہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ شکست کے بعد اس کی زندگی کا ہر لمحہ فاتح کی کامیابیوں میں ایک اضافہ ہے اور اس کا علاج سوائے اس کے کوئی نہیں کہ اپنی جان دیکر دشمن کو اس فائدہ سے محروم کر دیا جائے۔ اسی لئے خودکشی کرنے والا یہ بھی سمجھتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد لوگوں کا خیال فوراً اس کی طرف مبذول ہو جائے گا اور بجائے تجارت و تفریح کے لوگوں کا جذبۂ عزت و رحم اس سے متعلق ہو جائے گا اور یہ ایک بہترین صورت دشمن سے انتقام لینے کی ہے۔

مغرب میں اس قسم کے واقعات خودکشی کی مثالیں بہت ملتی ہیں۔ ایک اطالوی شخص اپنے وطن سے ہجرت کرکے نیویارک آیا اور بیس سال کی تگ و دو کے بعد اس نے غیر معمولی جاہ و ثروت حاصل کر لی اس کا انتہائی نقطۂ نظر صرف یہ تھا کہ وہ دولتمند ہونے کے بعد اپنے وطن واپس جائے گا اور وہاں اپنے ہمسروں کے مقابلہ میں اپنی کامیابی

کا مظاہرہ کرے گا۔ جہاز نیویارک سے ٹھیک نو بجے روانہ ہونے والا تھا۔ روانگی سے چند منٹ قبل یہ تختہ پر پہونچا اور اپنا ٹکٹ دکھا کر مطمئن ہوگیا۔ لیکن ٹھیک اسی وقت اس کا پروانہ راہداری طلب کیا گیا جو غلطی سے اس نے حاصل نہیں کیا تھا۔ جہاز کے کپتان نے اس سے کہا کہ بغیر پروانۂ راہداری کے اس کو سفر کی اجازت نہیں دی جا سکتی اسنے انتہائی کوشش کی کہ بغیر پاسپورٹ کے اس کو سفر کی رخصت مل جائے لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہوا۔ بس فوراً اس کے دماغ میں نفسیاتی ردِ عمل شروع ہوا۔ اس نے اپنی گزشتہ زندگی کا جائزہ لیکر سوچا کہ پچیس سال اس نے اسی لئے جدوجہد کی تھی کہ دولت کامیابی حاصل کرنے کے بعد اپنے وطن واپس جائے اور اب اس کو اک نہایت نامعقول عذر کی بنا پر اس سے باز رکھا جاتا ہے۔ اس لئے اس کے سامنے یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا وہ جہاز سے واپس جانے کی ذلت اٹھائیگا یا نہیں؟

اس کا جواب اس کے جذبۂ انانیت کی طرف سے یہ ملتا ہے کہ کیا تو نے خود اپنی ذاتی محنت و قابلیت سے اتنی غیر معمولی دولت حاصل نہیں کی اور کیا تیری تنہا تمنا یہ نہ تھی کہ تو اپنے وطن واپس جائے اور اب آخری لمحہ میں تجھ کو یہ آرزو خاک میں ملانی چاہیئے، تجھ کو یقیناً انتقام لینا چاہیئے۔

وہ فوراً جہاز کے کنارے تک پہونچتا ہے اور اپنے آپ کو سمندر کی لہروں کے سپرد کر کے ہمیشہ کے لئے دنیا سے غائب ہو جاتا ہے۔ لوگ یہ نیوٹیاں کرتے ہیں، کوئی کہتا ہے اس کا دماغ خراب تھا، کوئی کہتا ہے یہ کسی ایسی بیماری کا شکار تھا جس سے نشانہ پانے کی خود بھی اسے امید نہ تھی، کسی نے کہا کہ یہ کوئی مجرم تھا، کسی نے کوئی وجہ بتائی اور کسی نے کچھ۔ لیکن کسی کی نگاہ اس طرف نہ گئی کہ جو کچھ اس نے کیا وہ محض اپنے جذبۂ انانیت و خودداری کی بنا پر کیا اور اس سے بہتر انتقام وہ جہاز کے کپتان یا پروانۂ راہداری کے قانون سے نہیں لے سکتا تھا۔

کسی ایک مقصد کو مرکز زندگی قرار دے دینا، کسی ایک تمنا کو حیات کا مقصود بنا لینا، انسان میں ایک خاص قسم کا تفرد ( ) پیدا کر دیتا ہے اور ایسا شخص اپنی دنیا الگ بنا کر اس میں تنہا زندگی بسر کرنا پسند کرتا ہے اسی لئے انسانی حیات کے اس پہلو میں جس کا تعلق کسی نہ کسی طرح اجتماعیت سے ہے، خودکشی کی مثالیں بہت کم دیکھی جاتی ہیں۔

تفردی ( ) جماعت میں جن لوگوں کا شمار ہوتا ہے ان میں خاص خاص

لہ ( ) کا ترجمہ اکثر حضرات "انفرادیت" کرتے ہیں لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ انفراد و انفرادیت کا مفہوم تنہائی ( ) ہے میں نے (تفرد) کیا ہے اس سے ہم اصطلاحی مشتقات بھی زیادہ حاصل کر سکتے ہیں مثلاً ( ) کا ترجمہ (افراد) ( ) کا (تفردی) — اور ( ) کا (تفردیت)۔

یہ ہیں :۔ صناع، نقاش، مصنف، موسیقار، اداکار، صحافی، سرمایہ دار۔ اور واقعات خودکشی انھیں میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔ پیشہ ورطبقوں میں بھی چونکہ جذبۂ تفرد زیادہ قوی ہوتا ہے اس لئے ان میں بھی اس کی مثالیں بہت ملتی ہیں سوائے مذہبی واعظوں اور رہنماؤں کے اور اس کا سبب یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کو خدا کی مرضی میں تحلیل کرکے اپنا تفرد کھو بیٹھتے ہیں اور اسی لئے مذہبی لوگوں میں خودکشی کا جذبہ بھی مفقود ہو جاتا ہے۔ الغرض انسان کا جذبۂ انانیت یا اس کا تفرد اصل باعث خودکشی کا ہے اور جس جماعت میں یہ جذبہ ضعیف ہوگا اتنی ہی کم مثالیں خودکشی کی اس کے اندر ملیں گی۔ چنانچہ حبشیوں میں کم، وحشی قوموں میں ان سے کم اور جانوروں میں کوئی ایک مثال بھی اس کی نہ ملیگی۔

تجارتی حلقوں میں جب بازار کی حالت خراب ہوجاتی ہے تو خودکشی کے واقعے زیادہ دیکھے جاتے ہیں چنانچہ ۱۸۹۳ء اور ۱۹۰۸ء میں جب امریکہ انتہائی تجارتی مشکلات میں مبتلا ہوا تو بہت لوگوں نے خودکشی کرلی، لیکن اس سلسلہ میں مطالعہ کا یہ پہلو بہت دلچسپ ہے کہ آپ جسقدر زیادہ ساحل پیسفک کی طرف بڑھتے جائیں گے اتنا ہی زیادہ میلان خودکشی کی طرف لوگوں میں بڑھتا جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی خاص وجہ یہی ہے کہ ان لوگوں میں جذبۂ تفرد زیادہ قوی پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ جذبہ ان میں کیوں اسدرجہ شدید ہے؟ اس کی علمی توجیہ بھی پوشیدہ نہیں۔

تقریباً ایک صدی قبل کلفورنیا تقریباً غیر آباد تھا اور جدید آبادی کے لئے کھلا ہوا۔ چونکہ اس قطعۂ زمین کی زرخیزی مشہور تھی اس لئے تمام اطراف وجوانب سے لوگ کھنچ کھنچکر وہاں پہونچنے لگے۔ لیکن تجربہ کرکے کسی دوسرے ملک میں جانا آسان نہیں ہے، اس کو وہی لوگ انجام دیسکتے ہیں، جو صحیح وتوانا ہیں، مضبوط عزم وارادہ کے ہیں اور غیر معمولی محنت وجفاکشی کی اہلیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ جو جماعتیں وہاں پہونچیں، وہ وہی تھیں جن میں یہ صفات بدرجۂ اتم پائی جاتی تھیں۔ یہ وہاں پہونچے، بنجر زمینوں کو ہموار کیا، پہاڑوں کو کھودا، چشمے جاری کئے، کھیتیاں کیں، معدنیں دریافت کیں اور انتہائی مردانہ عزم کے ساتھ ان تھک کوشش کے ساتھ فراہمی زر میں مصروف ہوگئے، پھر ان لوگوں کے سامنے صرف ایک ہی سوال تھا یعنی کامیابی اور اگر یہ حاصل نہ ہوتو فنا ہوجانا کیونکہ وہ ناکامی کی صورت میں اب اپنے اصلی وطن مشرق کی طرف تو جا نہ سکتے تھے۔ پھر چونکہ موجودہ نسل انھیں کامیاب افراد کی ہے جن کی کوششوں نے ان میں غیر معمولی تفرد پیدا کردیا تھا، اس لئے یہ جذبہ نسلاً بعد نسلٍ برابر منتقل ہوتا رہا۔

یورپین ممالک میں بھی یہ جذبۂ انانیت بہت پایا جاتا ہے لیکن نہ اتنا جتنا امریکہ میں ہے۔ تاہم جنگ کے بعد یوروپ میں بھی خودکشی کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ جنگ کے دوران میں جو توقعات لوگوں نے قایم کی تھیں وہ جنگ کے بعد پوری نہ ہوسکیں اور اس طرح ان کے جذبۂ انانیت کو بہت صدمہ پہونچا۔ مثلاً کاشتکاروں کو لیجئے جو زیادہ آزادی کے خواہاں تھے وہ جنگ کے بعد اور زیادہ پابند ہوگئے۔ پہلے اگر صورت ایک منظم مرکزی حکومت کی تھی تو اب اس نے حکومت افراد کی صورت اختیار کرلی ہے اور جماعتوں کے اختلاف رائے نے

ایسی سیاسی تفریق باہر گر پیدا کردی ہے کہ جذبۂ تفوق و انانیت فوراً حرکت میں آجاتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ایک ملک کی سیاسی حالت، بہترین آلۂ جذبات خودکشی کی پیمائش کا ہے۔ مگر یہ مقولہ ممالک مغرب پر صادق آتا ہو تو آتا ہو۔ مشرق اور خصوصیت کے ساتھ ہندوستان میں پندار غیرت اس قدر محو ہوگیا ہے کہ یہاں سوال تفوق و برتری کا پیدا نہیں ہوتا بلکہ زیادہ سے زیادہ یہ کہ غلامی و محکومیت کی کونسی صورت زیادہ بہتر ہوسکتی ہے۔

خودکشی کا ایک سبب محبت بھی ہے، لیکن یہاں بھی وہی جذبۂ انانیت کارفرما ہے، کیونکہ ایک عاشق کلیتاً اپنے محبوب پر مستولی ہوجانا چاہتا ہے اور جب یہ اس کی خواہش (جو اس کی زندگی کی تنہا خواہش ہے) پوری نہیں ہوتی تو وہ خودکشی کرلیتا ہے اس خیال سے بھی کہ اب اس کی زندگی بالکل بے معنی ہے اور اس یقین کی بنا پر بھی کہ خودکشی کے بعد وہ ایک مستقل نقش محبوب کے دل پر چھوڑ جائے گا۔

حال ہی میں ایک عجیب واقعہ آسٹریا میں پیش آیا۔ ویانا کا ایک خوبصورت نوجوان کسی لڑکی سے محبت کرتا تھا جو بہت معزز خاندان کی تھی اور جو ایک بار شادی کا اقرار کرکے اس سے مکر گئی تھی۔ اس نوجوان کو جب اس انکار کی اطلاع ہوئی تو اس نے آخری ملاقات کی خواہش ظاہر کی جس کو لڑکی نے منظور کرلیا۔ جب یہ وہاں پہونچا تو اپنی وہ انگوٹھی واپس مانگی جو اس نے پیمان محبت و ازدواج کی صورت میں تحفتاً پیش کی تھی، لڑکی نے فوراً بلا تامل واپس کردی۔ اس نے اس انگوٹھی کو اپنے قلب پر رکھا اور اسی جگہ ریوالور رکھ کر داغ دیا۔ انگوٹھی دل کے اندر پیوست ہوگئی اور وہ فوراً مرگیا۔ یہ حرکت اس نے صرف اس لئے کی تھی کہ وہ اپنی محبوبہ کی توجہ (اور شاید محبت بھی) حاصل کرسکے چنانچہ اس واقعہ کا اس پر بہت اثر ہوا اور وہ بھی پھوٹ پھوٹ کر خوب روئی۔

جنسی جذبہ کے سلسلہ میں جو جذبۂ انانیت و تفرد پیدا ہوتا ہے اس میں کبھی کبھی اخلاقی انحطاط کی بھی صورت پیدا ہوجاتی ہے۔ مثلاً حال ہی میں لکھنؤ کے ایک اسکول میں نہایت افسوسناک واقعۂ قتل و خودکشی کا ایسا دیکھنے میں آیا جس کے اندر اخلاقی انحطاط بدرجۂ اتم نمایاں تھا۔

ایک نوجوان لڑکا جو دسویں درجہ میں پڑھتا تھا وہ ایک دوسرے لڑکے سے محبت کرتا تھا۔ یہ لڑکا بہت معزز خاندان کا تھا اور کہا جاتا ہے کہ بہت خوبصورت تھا۔ ان دونوں کے واقعۂ محبت کی کوئی تفصیلی داستان تو معلوم نہ ہوسکی لیکن نظر بہ واقعات و حالات یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کمسن لڑکے کو اس کی طرف کبھی میلان نہ ہوا تھا یا اگر کسی وقت ہوا تھا تو اب باقی نہ رہا تھا۔ بہرحال یہ محبت ناکامی کی نہایت سخت مثال تھی جو نوجوان عاشق کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ ایک دن وہ کمسن لڑکے کے درجہ میں گیا اور وہاں سے اسے بلاکر اسکول کی پشت پر ایک گلی میں لے گیا۔ یہاں پہونچکر ان دونوں میں کیا باتیں ہوئیں اس کا علم کسی کو حاصل نہیں ہوسکا لیکن وقتاً ایک چیخ کی آواز سنکر لوگوں کو ادھر متوجہ کردیا اور جب وہاں پہونچے تو معلوم ہوا کہ دونوں لڑکوں کی بیجان لاشیں وہاں پڑی ہوئی

تھیں، نوجوان عاشق نے پہلے اپنے محبوب کو زخمی کرکے ہلاک کیا اور اس کے بعد آپ نے گلے پر چھری پھیر لی۔ یہاں بھی اسی جذبۂ انانیت کی کارفرمائی تھی لیکن جنسی خواہش کے شمول نے اس میں اتنی کثافت پیدا کردی کہ خودکشی کرنے والے نے پہلے اسی کو فنا کردیا جس نے اس کے جذبات کو ٹھکرایا تھا۔ گویا اب اس کے سامنے سوال محبت کا نہ تھا بلکہ صرف انتقام کا تھا، یعنے اس نے صرف یہی نہیں چاہا کہ وہ اپنی جان دیکر اس عذاب سے چھوٹ جائے بلکہ اپنے محبوب کو قتل کرکے اس نے اس کا امکان بھی نہ رہنے دیا کہ وہ کسی اور سے یا کوئی اور اُس سے محبت کرسکے۔ یہ گویا ایسا جذبۂ انانیت تھا جس کے ماتحت وہ ساری دنیا سے انتقام لینے پر تل گیا تھا۔

محبت کے سلسلہ میں عورتیں بھی خودکشی کرتی ہیں لیکن بہ نسبت مردوں کے کم اور اس کا سبب صرف یہ ہے کہ عورتوں میں یہ جذبۂ انانیت وتفرد مردوں سے کم پایا جاتا ہے۔ کسی چیز پر تنہا قابو حاصل کرنا کسی خاص مقصد میں مرکزیت پیدا کرکے تمام دنیا کی مخالفت پر آمادہ ہوجانا یہ صرف مرد کی ذہنیت ہے۔ عورت چونکہ فطرتاً سریع التاثر واقع ہوئی ہے، اور اپنے ہر ماحول سے متاثر ہوجانے کی اہلیت رکھتی ہے اس لئے اس کے جذبات دیرپا نہیں ہوتے عورت کا فطری میلان تقلید ہے، قیادت نہیں، وہ کسی اور کی ہدایت پر عمل کرنا بہ نسبت خود ہدایت کرنے کے زیادہ پسند کرتی ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ اس میں "جذبۂ انانیت" مرد سے زیادہ قوی نہیں ہوسکتا اور یہی وجہ ہے کہ خودکشی کرنے میں وہ مرد کی طرح جری نہیں۔

جذبۂ "انانیت" رکھنے والوں میں ایک طبقہ اور ہے جس کو اصولاً خودکشی زیادہ کرنا چاہئے اور وہ طبقہ نابغہ[1] (Genius) کا ہے کیونکہ جذبۂ خودپرستی جیسا اس طبقہ میں پایا جاتا ہے کسی اور میں نہیں۔ لیکن ایسے لوگ بہت کم خودکشی کرتے ہیں، اس کا سبب یہ ہے کہ ایک ذہین شخص کا تخیل جتنا شدید وقوی ہوتا ہے اتنا ہی وسیع بھی ہوتا ہے، یعنی اگر وہ کسی کوشش میں اپنے رقیب سے مجروح اور اپنی محرومی وناکامی کو برداشت نہیں کرسکتا تو اسی کے ساتھ وہ تمام اسباب وعلل، نتائج وغایات پر بھی غور کرتا ہے اور اسی طرح اس میں ایک کیفیت تامل اور پس وپیش کی بھی پیدا ہوتی رہتی ہے جو اس کے جذبۂ "انانیت" کی شدت کو ضعیف بھی کرتی رہتی ہے اور اسی لئے وہ خودکشی کی حد تک نہیں پہونچتا۔

کاوپر (انگریزی کا مشہور شاعر) شکایت کیا کرتا تھا کہ اس نے بارہا خودکشی کا ارادہ کیا لیکن ہمیشہ غیر متعلق خیالات نے اس کے ذہن میں مجتمع ہوکر اس خیال سے اسے باز رکھا۔ الغرض ذہین لوگوں میں ان کی وسعت خیال، جذبۂ

---

[1] نابغہ عربی لفظ ہے جو نہایت ہی غیر معمولی ذہین شخص کے لئے استعمال ہوتا ہے اور جسے انگریزی میں (Genius) کہتے ہیں اُردو میں کوئی ایک لفظ اس کے لئے موجود نہیں ہے اس لئے مجبوراً یہ مقبول لفظ استعمال کیا گیا۔

انانیت کو اقدام خودکشی کے حد تک نہیں پہونچنے دیتی اور یہی سبب ہے کہ اس طبقہ میں شاذ و نادر ہی کوئی مثال اسکی ملتی ہے ——— خودکشی کی ایک قسم اور بھی ہے جو متذکرۂ بالا تمام صورتوں سے بالکل علحدہ حیثیت رکھتی ہے اور اس کا تعلق جذبۂ انانیت سے نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف ایک مرض کی حیثیت رکھتی ہے یعنی جس طرح اور بیماریاں لاحق ہوتی ہیں، اسی طرح دفعتاً بغیر کسی سبب کے ایک احمقانہ جذبہ خودکشی کا انسان میں پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اپنی جان دیدیتا ہے۔ یہ مرض صرف اعصابی سے تعلق رکھتا ہے اور ذہن و دماغ کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس کی ایک خاص مثال لارڈ کلایو تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب وہ کمسن تھا تو اس وقت اس نے بارہا خودکشی کا اقدام کیا لیکن اتفاق سے اس کا کوئی دوست یا عزیز موقعہ پر پہونچ جاتا تھا اور اس کا یہ ارادہ پورا نہ ہو سکتا تھا۔ بعد کو اس نے فاتح ہندوستان ہونے کی حیثیت سے جو ترقی و شہرت حاصل کی کسی سے مخفی نہیں لیکن اقدام خودکشی کا مرض اس سے کبھی جدا نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ جب وہ انگلستان واپس گیا تو اسوقت بھی وہ اس بیماری میں مبتلا تھا چنانچہ جس وقت وہ سارے ملک سے خراج تحسین حاصل کرنے کے بعد گھر واپس آیا تو دفعتہً اس بیماری کا شدید دورہ اس پر طاری ہوا اور خود اپنی گولی سے مر گیا۔

ڈاکٹر اسٹراہان نے ایک مثال اسی قسم کی پیش کی ہے۔ ایک عورت جو چھ بچوں کی ماں تھی ایک دن دہلیز میں بیٹھی ہوئی اطمینان سے سی پرو رہی تھی کہ دفعتہً اقدام خودکشی کا مرض اس پر مسلط ہو گیا اور وہ قریب ہی کسی خندق میں جا کر ڈوب مری۔ اس نوع کے واقعات تاریخ میں بہت کم ملتے ہیں تاہم ہیں ضرور اور ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صورت بالکل اعصابی مرض کی ہے اور اس کو کسی جذبۂ نفسی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایسا کرنے والوں کے سامنے نہ کوئی سبب موجود ہوتا ہے اور نہ اس کی کوئی نہایت بلکہ اعصاب میں دفعتاً ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کے ماتحت ایک انسان اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالتا ہے اس لیے اس کو اعصابی جنون کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔

خودکشی کی ایک صورت اور بھی ہے جس کا تعلق جذبۂ "شہادت و قربانی" سے ہے۔ خودکشی کی دوسری صورتوں کی طرح اس میں بھی "جذبۂ انانیت" کام کرتا ہے لیکن زیادہ بلند صورت میں۔ معمولی صورتوں میں یہ جذبہ صرف اپنی ذات اور اپنی ذاتی خواہش کے حصول سے متعلق ہوتا ہے لیکن اس صورت میں مقصد کی بلندی ملک و قوم یا ابنائے جنس سے وابستہ ہوتی ہے اور صرف دوسروں کی بھلائی کا خیال اس کا سبب ہوتا ہے۔ بہرحال ذہنیت وہی ہے گو اس کا صرف مختلف ہوتا ہے۔

قدیم عقلیہ کی تاریخ میں امپیڈاسلس (Empedocles) کا واقعہ خاص شہرت رکھتا ہے یہ شخص قوم کا اتنا محبوب تھا کہ وہ اس کے سامنے ہر چیز پیش کرنے کے لیے طیار تھی یہاں تک کہ حکومت

دینے پر بھی آمادہ تھی۔ لیکن اس نے ان تمام ہدایا و عطایا کو ٹھکرا دیا کیونکہ وہ شخص حکومت کا سخت مخالف تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ قوم اس کی عاشق ہے لیکن اس کا جذبہ انانیت صرف اس سے آسودہ نہ ہو سکتا تھا، وہ اس سے بھی زیادہ کچھ اور چاہتا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ بجائے انسان کے لوگ اسے دیوتا یا پیغمبر سمجھیں۔ پھر چونکہ وہ فلاسفر بھی تھا اور عوام کی ذہنیت کو اچھی طرح جانتا تھا اس لئے وہ ایک دن دسوویس کے آتش فشاں پہاڑ پر چڑھ گیا اور اس کے دہانے میں اپنے آپ کو گرا دیا۔ بعد کو جو کچھ مواد ملا اس کی خواہش کے مطابق تھا، یعنی لوگوں نے اس کی پرستش شروع کر دی اور اس کے بت بنا بنا کر پوجے جانے لگے۔ جذبۂ انانیت کی شدت کی یہ انتہائی صورت ہے۔

قدیم روم کے بادشاہ اوتھو (Otho) کو جب جنگ بڈریاکم میں شکست ہوئی تو بجائے واپس جانے کے اس نے اپنے آپ کو ہلاک کرنا زیادہ مناسب سمجھا تاکہ آئندہ خونریزی ختم ہو جائے، چنانچہ اس واقعہ کے بعد لڑائی ختم ہو گئی اور خونریزی بھی موقوف۔ یہ جذبہ بھی جذبۂ شہادت کے تحت میں آتا ہے۔

مسیح کی زندگی کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ بہ حیثیت معلم اخلاق و فیلسوف ہونے کے ان کا کیا مرتبہ تھا۔ ہزاروں آدمی ان کے ساتھ ساتھ رہتے تھے اور شہرت کی اس منزل پر پہونچ گئے تھے جو مشکل سے کسی کو نصیب ہو سکتی ہے، لیکن اس دوران میں ان کو "روحانی برتری" حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے اور لوگ ان سے منحرف ہونے لگتے ہیں، یہاں تک کہ ان کے بارہ حواریین بھی مشتبہ ہو جاتے ہیں۔ اپنی انتہائی تمنا کو یوں برباد ہوتے ہوئے دیکھ کر ان کے جذبۂ "انانیت" کو تحریک ہوتی ہے اور وہ حصول شہادت پر آمادہ ہو جاتے ہیں، وہ یروشلم کی طرف جاتے ہیں جہاں وہ اپنی موت یقینی سمجھتے تھے اور آخر کار شہید ہو کر انسان سے خدا کے بیٹے ہو جاتے ہیں۔ سقراط کی داستان پڑھئے تو وہاں بھی یہی جذبہ کارفرما نظر آئے گا اور یہی وہ بلند نظری تھی جو حسین کو میدانِ کربلا کی طرف کھینچ لے گئی۔

نگار کے پرانے پرچے

حسب تفصیل ذیل موجود ہیں اور علاوہ محصول اس قیمت پر مل سکتے ہیں جو درج کی جاتی ہیں:-

(۱۹۲۲ء) ستمبر و اکتوبر ۴ر فی پرچہ۔ (۱۹۲۳ء) مئی ۴ر۔ (۱۹۲۴ء) جنوری، فروری، مارچ، اپریل، مئی، اگست ۴ر فی پرچہ۔ (۱۹۲۶ء) جنوری، جون، اکتوبر، نومبر ۴ر فی پرچہ۔ (۱۹۲۷ء) اپریل، مئی، جون ۴ر فی پرچہ۔ (۱۹۳۰ء) مئی، ستمبر، اکتوبر، نومبر ۴ر فی پرچہ۔ (۱۹۳۱ء) مارچ، جولائی، اگست ۴ر فی پرچہ۔ (۱۹۳۲ء) فروری، جولائی، اکتوبر، دسمبر ۴ر فی پرچہ۔ (۱۹۳۴ء) فروری، مارچ، اپریل، مئی، جون، اکتوبر ۶ر فی پرچہ (۱۹۳۵ء) فروری، مئی، جون، جولائی، اگست، دسمبر ۸ر فی پرچہ۔ (۱۹۳۶ء) جنوری (غالب نمبر) ۱۲ر۔ فروری تا دسمبر علاوہ اپریل ۴ر فی پرچہ۔ منیجر نگار

تاریخ کا ایک ورق مجہول

یہ دسواں مرتبہ ہے کہ اہل عرب طرابلس کا قلعہ فتح کرنا چاہتے ہیں۔ چاروں طرف سے قلعہ گھیر لیا گیا ہے اور نہایت سختی سے جنگ جاری ہے، محصورین بھی کچھ کمزور نہیں ہیں، برابر کا جواب دے رہے ہیں۔ آخر کار اہلِ عرب نے حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ طے کیا کہ فی الحال پیچھے ہٹ جانا چاہیے، تاکہ پھر نئی قوت سے حملہ کیا جائے۔

یہ واقعہ ۵۸۱ھ یا ۱۱۸۵ء کا ہے۔ یوسف صلاح الدین ایوبی نے اس بات کی قسم کھالی ہے کہ دو سال کے اندر اندر وہ اپنے ممالک فرنگیوں سے واپس لے لیگا، اور ادرشلیم پر جسے صلیب پرستوں نے دوبارہ حاصل کرلیا تھا، اسلامی علم نصب کرکے چین لیگا۔

سلطان نے یہ طے کیا کہ سب سے پہلے تمام طاقت طرابلس کی طرف صرف کرنا چاہئے کیونکہ ادرشلیم تک پہونچنے کا دروازہ یہی تھا اور مغرب کے سارے بیڑے اسی طرف سے ہوکر گزرتے تھے، اس لئے اگر یہ فتح ہوگیا تو تمام بیرونی امداد کا خاتمہ ہوجائے گا اور فرنگی زیر ہوجائیں گے۔

اسوقت طرابلس کا حاکم اور فرنگیوں کا قائد ایک نہایت جری شخص تھا جسے مسلمان "قومس تولوزی" اور یہودی "ریمون نجم" کے نام سے یاد کرتے تھے۔

الغرض عربوں اور فرنگیوں کے درمیان نہایت سخت خونریزی جاری تھی اور کسی کو پتہ نہیں تھا کہ اس جنگ کا نتیجہ کیا ہوگا۔

ٹھیک اسی زمانہ میں، لاذقیہ اور گنیہ سرو کے جنگل میں ایک راہب رہتا تھا، جس نے رات بسر کرنے کے لئے بھی اور مضبوط چٹانوں کے اندر ایک جھونپڑی ڈال لی تھی، وہ دن رات اسی میں پڑا رہتا تھا۔ وہ ہر وقت کسی سوچ میں رہتا، معلوم ہوتا تھا کہ اسے غیر معمولی آلام و مصائب سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اس کے متعلق کسی کو کچھ علم نہ تھا۔ وہاں کے قرب و جوار کے رہنے والے اسے "فقیر" کے نام سے یاد کرتے تھے اور خدا رسیدہ بزرگ سمجھتے تھے، انھیں اس کے گزشتہ حالات معلوم کرنے کی چنداں ضرورت بھی نہ تھی، کچھ عرصہ کے بعد آس پاس کی تمام آبادیوں میں اس کا چرچا ہونے لگا، ہر جگہ اسی کا ذکر لوگوں کی زبانوں پر تھا۔ لوگ اسے بہت بڑا ولی سمجھتے

تھے اور لوگ بلاتفریق مذہب اس کے پاس جاتے ہاتھوں کو چومتے اور دعائیں طلب کرتے۔ لوگوں کا جوشِ عقیدت اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ وہ اس "سعادت" کے حصول میں ایک دوسرے پر سبقت لیجانیکی کوشش کرتے چاہے وہ مسلمان ہو یا نصرانی۔

زائرین میں ایک جوان اور خوبصورت لڑکی بھی تھی، لانبا قد، کشادہ پیشانی، سڈول جسم، بڑی بڑی غزالی آنکھیں، غرضکہ وہ تمام چیزیں جو حسن کے مفہوم کو متعین کرسکتی ہیں اسے حاصل تھیں وہ ہفتہ میں ایک مرتبہ آتی، اور اس کے ساتھ "ریمون دی تولوز" کا ایک سوار بھی ہمیشہ ساتھ رہتا۔

یہ کون ہے؟ اس کا اس گوشہ نشین راہب سے کیا تعلق ہے؟ کسی کو معلوم نہ تھا جو کچھ لوگوں کو معلوم ہوسکا وہ صرف یہ تھا کہ اس کا نام "میری ٹریز" تھا وہ ایک روز "طرابلس" کے حاکم "کونٹ ریمون دی تولوز" کے پاس گئی اور کہا کہ "میرے والد جنگ صلیبیہ میں کام آچکے ہیں اور اب چونکہ میرے خاندان میں کوئی نہیں رہا اس لئے محل میں رہنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے، تاکہ ان عورتوں کے ساتھ جو اس میں رہتی ہیں اپنا غم غلط کرسکوں"۔

اس نے یہ بھی ظاہر کیا کہ "میں فرانس کے ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتی ہوں، میں اس مقدس سرزمین میں اپنے والد کے ساتھ ایک نذر پوری کرنے آئی تھی اور ارادہ تھا کہ بیت المقدس کے فریضۂ حج کو پورا کرکے وطن واپس جاؤں گی، لیکن والد نے چاہا کہ وہ بھی جنگ میں حصہ لیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں گھر سے بے گھر ہوگئی"

کونٹ ایمون بہت مہربانی سے پیش آیا اور اس نے محل میں رہنے کی اجازت دیدی۔ یہ ۱۱۷۵ء کا واقعہ ہے۔

اس روز سے یہ محل میں رہنے لگی لیکن کونٹ کی اجازت سے یہ ہفتہ میں ایک بار خاص سوار کے ساتھ راہب سے ملنے ضرور جاتی تھی۔

اسی حالت میں دس سال گزر گئے۔ ہفتہ میں ایک مرتبہ وہ لڑکی راہب کے پاس جاتی اور کونٹ بھی کبھی کبھی ساتھ جاتا، دسمبر ۱۱۸۵ء کی ایک صبح کو "کونٹ ریمون دی تولوز" کے قصر کے پاس ایک نوجوان لبنان کا آیا اور اس نے وزیر طرابلس سے یہ کہکر ملنے کی خواہش ظاہر کی کہ وہ راہب کے پاس سے پیغام لایا ہے۔

جب باریابی کی اجازت ملی تو اس نے راہب کی طرف سے سلام کے بعد کہا کہ "مقدس راہب نے جو ہم سب کے نزدیک نہایت ہی محترم اور بزرگ ہستی ہے، مجھے آپ کے پاس اس لئے بھیجا ہے کہ میں اس کی ایک خواہش آپ تک پہونچادوں۔ اس کی آرزو ہے کہ آپ اسی وقت "میری ٹریز" کے ساتھ تشریف لائیں، کیونکہ اگر آپ صبح تشریف لے گئے تو غالباً آپ سے ملاقات نہ ہوسکے گی۔

اس گفتگو کو سنکر کاونٹ نہایت اضطراب و پریشانی کی حالت میں اٹھا، لڑکی کو آواز دی، اور فوراً گھوڑے پر سوار ہوکر راہب کی اقامتگاہ کی طرف روانہ ہوگیا۔

راہب کی حالت بہت زیادہ سقیم تھی ۔۔ ضعف کا یہ عالم تھا کہ گفتگو کرنا مشکل تھا، اس نے لڑکی کے زانو پر سر ڈالدیا اور کاونٹ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر آہستہ آہستہ یوں گفتگو شروع کی :۔

" میرے محترم ! وقت کا تقاضا ہے کہ میں اپنی حقیقت سے آپ کو مطلع کروں اور ان تمام رازوں سے جو میری زندگی سے متعلق ہیں آپ کو آگاہ کروں۔ کیونکہ اب میرا آخری وقت ہے، موت سر پر آچکی ہے ۔۔۔۔۔۔"

چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ سانس پھولنے لگی، حلق سوکھ گیا، تھوڑی دیر تک چپ رہا اور پھر طاقت کو مجتمع کرکے سلسلۂ کلام جاری کیا ۔۔۔۔ "کونٹ ! "ہنری دی مونفور" کی باتیں جو اسوقت تم سے گفتگو کر رہا ہو ذرا غور سے سنو۔

" ریمون دی تولوز" نے تعجب سے اس کے جملہ کو دہرایا

—— " ہنری دی مونفور ؟ !! "

—— " ہاں ! ۔۔۔۔ ہنری دی مونفور ۔۔۔۔۔ آپ کو متعجب نہیں ہونا چاہئے ۔۔۔۔۔ تمام لوگوں کا یہ خیال ہے کہ بہادر فرانسیسی جو اپنی لڑکی کے ساتھ اس مقدس زمین کی زیارت کی غرض سے آیا تھا، جنگ میں کام آگیا جس نے اپنی زندگی سے مایوس ہوکر قصداً اپنے نفس کو خطرے میں ڈالا تھا ۔۔۔۔"

—— " ہاں ! ۔۔۔۔ ہم لوگوں کا ایسا ہی خیال ہے ۔۔۔۔۔"

—— " مگر تم لوگ حقیقت سے واقف نہیں ہو ۔۔۔۔ ہنری دی مونفور مرا نہیں ہے، جیسا کہ لوگوں کا خیال ہے بلکہ وہ ابھی تک زندہ ہے اور وہ اس وقت تم سے گفتگو کر رہا ہے ۔۔۔ میری تمام باتوں کو غور سے سنو تاکہ اس واقعہ کو اپنے بعد دوسرے تک منتقل کرسکو ۔۔۔ "

راہب نے چند منٹ خاموش رہکر پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا ۔۔۔۔ " ہم لوگ قدس سے واپس ہوکر ساحل لبنان کی طرف جا رہے تھے، ہمارا قافلہ بیس مرد اور تین عورتوں پر مشتمل تھا، انھیں میں میری یہ لڑکی بھی تھی ۔۔۔۔۔ ہم لوگ نہایت اطمینان کے ساتھ نہایت تیزی سے آگے قدم بڑھائے چلے جا رہے تھے کہ ایک گھنی جھاڑی میں دشمن کے گروہ سے مڈبھیڑ ہوگئی جو پہلے سے چھپے بیٹھے تھے۔ اثنائے قتال میں میری نگاہ ایک ایسے شخص پر پڑی جو گھائل ہوکر گر پڑا تھا، اور ہم میں کا ایک شخص اس کا کام تمام کرنا چاہتا تھا میں فوراً آگے بڑھا اور اس ارادہ سے اُس کو باز رکھا اور مجروح سے مخاطب ہوکر کہا کہ تم اطمینان رکھو ! جب تک میں موجود ہوں کوئی تمھیں ہلاک نہیں کرسکتا ۔۔۔۔ جنگ بہت جلد ختم ہوگئی، ہمیں شکست ہوئی، اور دشمن ہمیں گرفتار کرکے اپنے سردار کے پاس لے چلے۔

—— " تم اس کے نام سے واقف ہو ؟ "

—— امیر غالب الشہابی ۔۔۔۔ عربی النسل ہے حال ہی میں " وادی تیم " میں آیا ہے، سلطان کے ملک کا ۔۔۔"

—— میں اس امیر سے خوب واقف ہوں ۔ نہایت بہادر اور شجاع ہے ۔

—— ہاں اس نے اپنی بہادری اور شجاعت کا سکہ لوگوں کے دلوں میں بٹھا دیا ہے۔
—— اپنا واقعہ پورا کیجئے،
—— ہم لوگوں کو امیر کے پاس لایا گیا۔۔۔۔ یہ امیر وہی تھا جس کی جان میں نے جنگ کے سلسلہ میں بچائی تھی۔۔۔!
—— پھر تم نے اس سے کچھ کہا نہیں؟
—— قبل اس کے کہ میں کچھ کہوں اس کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ اس نے فوراً حکم دیا کہ بیڑیاں کاٹ دی جائیں اور مجھے آزاد کر دیا جائے۔

اسوقت میں اس بہادر کے سامنے تھا جس نے بڑے بڑے بہادروں کے قدم اکھاڑ دئے تھے، لوگ اسکے نام سے کانپتے تھے، میں نے اس سے کہا "میرے محترم! آپ نے مجھے اس لئے آزاد کیا ہے کہ میں نے اثنار جنگ میں آپ کی جان بچائی تھی، لیکن میں آپ کی اس عنایت کے بجائے اپنی ایک دوسری خواہش کی تکمیل چاہتا ہوں امید ہے کہ مجھے رہا کر کے جس وسعتِ قلبی کا اظہار کیا گیا ہے اس معاملہ میں بھی اسی سے کام لیا جائے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے بجائے میری لڑکی کو آزاد کر دیا جائے جو ان قیدیوں میں اسیر ہے۔ اور اسکی بیڑیاں مجھے پہنا دی جائیں۔
—— اس نے کیا جواب دیا؟
—— میری طرف اس نے گھور کر دیکھا، اس کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے، اور اسنے انتہائی غصہ کی حالت میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "تم اپنی لڑکی کے ساتھ جا سکتے ہو۔۔۔" میں نے ہاتھ بڑھایا، اس نے مصافحہ کیا اور کہا "تم جا سکتے ہو"

میں نے کہا کہ "میں نے صرف آپ کی جان بچائی تھی، لیکن آپ نے اس کے بدلہ میں دو نعمتوں سے سرفراز کیا یعنی غلامی اور قید سے دو جانوں کو آزاد کیا۔ کیا مجھے اس بات کا موقع دیا جائے گا کہ میں اس احسان کا عوض پیش کر سکوں؟"

اس نے جواب دیا کہ اگر تمہاری یہ خواہش ہے تو بہترین عوض یہ ہو سکتا ہے کہ ہم سے ہمیشہ کیلئے جنگ سے باز آجاؤ، کیا تم اس کے لئے تیار ہو؟ ۔ میں نے اس کا وعدہ کر لیا۔
—— کیا تم نے ایسا ہی کیا؟
—— ہاں! میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا، میں نے وعدہ کر لیا تھا اور اسے میں کسی طرح توڑ نہیں سکتا تھا، اسوقت سے میں نے تہیہ کر لیا کہ اپنی بقیہ زندگی ان پہاڑوں میں بسر کر دوں گا تاکہ جنگ سے بالکل علٰحدہ رہوں!
—— اور تمہاری لڑکی؟
—— میری لڑکی؟!۔۔۔۔ کیا آپ نے ابھی تک نہیں پہچانا؟ ۔۔۔۔۔ اس نے آپ کے یہاں پناہ لی ہے

اور تقریباً دس سال سے آپ کے قصر میں مقیم ہے !!

—— "کیا میری ٹریز ؟

—— ہاں ! میری ٹریز ! ۔۔۔ یہی میری لڑکی ہے اس نے اپنا وعدہ پورا کیا اس نے کسی کو اپنا نام نہیں بتلایا اور نہ اس کا اظہار کیا۔ وہ راہب جس کی ہر ہفتہ وہ زیارت کرتی ہے فی الواقع اس کا باپ "ہنری دی مونفور" ہے۔

لڑکی یہ تمام باتیں سنتی رہی، بالآخر دفورِ غم سے بیتاب ہوکر باپ کی گردن میں باہیں ڈالکر رونے لگی، فقیر نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے تسلی دیتے ہوئے کہا:۔

—— بیٹی ! اب میں اس عالم سے کوچ کر رہا ہوں، لیکن میرا ضمیر مطمئن ہے مجھے خوشی ہے کہ مجھے اب تمہاری طرف سے کوئی فکر نہیں رہی ۔۔۔ میں تمہیں نہایت ہی وسیع النظر، عالی ہمت، اور شریف شخص کے حوالے کرکے جا رہا ہوں، تم یقیناً اپنے باپ کو کھو رہی ہو لیکن تم "ریمون دی تولوز" کو اپنے باپ سے زیادہ مہربان، اپنے بھائی سے زیادہ خیرخواہ اور اپنے اعزہ واقارب سے زیادہ ہی خواہ پاؤ گی، وہ تمہاری ہر طرح مدد کرے گا"

اس کے بعد وہ کونٹ کی طرف متوجہ ہوا، اپنے بستر سے کچھ میلے کچیلے کاغذ نکالے اور انھیں دیتے ہوئے بولا:۔

—— "آپ انھیں حفاظت سے رکھئے، ان سے لڑکی کا حق وراثت ثابت ہوگا ان کے ذریعہ وہ اپنے حق کی مستحق ثابت ہوگی اور ۔۔۔۔"

راہب اس حد تک پہونچا تھا کہ آواز بالکل بند ہوگئی، چہرہ زرد پڑگیا، ایک مرتبہ انگڑائی لی، حسرت بھری نگاہوں سے ایک مرتبہ اپنی لڑکی کو دیکھا اور ایک ہچکی کے ساتھ ختم ہوگیا۔

اس کے بعد راہب (ہنری دی مونفور) کو کفنا کر اسی غار میں دفن کر دیا گیا اور ہر چہار جانب درخت لگا دئے گئے تاکہ ان کے ذریعہ اس کی حفاظت ہوسکے۔

۱۱۸۶ء میں میری ٹریز سرد کے اس جنگل میں آئی تاکہ اپنے وطن فرانس جانے سے قبل ایک مرتبہ اپنے باپ کی زیارت کرسکے۔

ٹھیک اسی روز جس دن وہ لڑکی اپنے باپ کی زیارت کرنے گئی ہوئی تھی، سلطان صلاح الدین اپنے عزم کے مطابق دو سال کے اندر اندر فاتح کی حیثیت سے اور شلیم میں داخل ہو رہا تھا۔

یہ ۵۸۳ھ مطابق ۱۱۸۷ء کا واقعہ ہے۔

جاپانِ جدید

تجارت وصناعت کا ارتقاء

اسّی برس گزرے، جاپان تمام ممالک سے الگ ایک گمنام جزیرہ تھا۔ لیکن اب وہ دنیا کے بہترین صنعتی ممالک میں شمار ہوتا ہے۔ یہ حیرت خیز انقلاب کس طرح واقع ہوا؟ ہمارے لئے اس کا مطالعہ غالباً دلچسپی کا موجب ہوگا۔

جاپان کا معاشی ارتقا، مغرب کے صنعتی انقلابات سے بالکل مختلف ہوا ہے۔ اس لئے پہلے ہمیں انگلستان اور جاپان کی صنعتی تاریخ کا موازنہ کرنا ضروری ہوگا۔

انگلستان میں صنعتی دور کا آغاز اُسوقت ہوا جب کارخانوں میں الزبتھ کے زمانہ کے مروّجہ سرکاری ضوابط کی جگہ شخصیت اور آزادانہ مقابلہ نے لی۔ یہ وہ وقت تھا جب صناعین کا مذہب "آزاد تجارت" ہوگیا اور اُس میں کسی قسم کی مداخلت برداشت نہیں کی جاسکتی تھی۔ دوسرے معنوں میں برطانیہ عظمیٰ کی تجارتی مقاومت ومسابقت کسی حکومت یا قوم کی رہینِ منت نہ تھی۔ بلکہ اُس کی عظمت اور اُس کے فروغ کا باعث انفرادی سرمایہ تھا۔

اس کے بالمقابل جاپان میں "مائجی دور" کے آغاز میں کوئی صاحب ثروت جماعت نہ تھی جو انگلستان کی طرح تجارت وصناعت کی طرف توجہ کرسکتی۔ اور اگر کوئی جماعت تھی بھی تو وہ تجارتی کاموں سے بالکل بے بہرہ اور نابلد تھی۔ دوسرے جاپان میں معیارِ زندگی پست ہونے کے سبب سے تعیش وآرام کے سامان کی بہت کم مانگ تھی۔ اس لئے اُن کو جدید طرزِ صناعت کا کوئی خاص تجربہ حاصل نہ تھا اور نہ اُس کے حاصل کرنے کی کوئی ضرورت محسوس ہوتی تھی کیونکہ تمام مطالبات گھر میں ہی پورے ہوجاتے تھے۔ تیسرے وہ بوجہ غربت کے کوئی بڑا سرمایہ جو آج کل کی صنعتی مہمات کے لئے اشد ضروری ہے بہم نہ پہونچا سکتے تھے۔ چوتھے صدیوں کی اقطاعی حکومت کی وجہ سے انمیں جذبۂ جدت واختراع جو ہر قسم کی ترقی میں معاون ہوتا ہے، مٹ چکا تھا اور وہ کسی نئے کام کے تجربہ کے لئے طیار نہ تھے۔

اِن وجوہ کی بنا پر شروع ہی سے حکومت کو ہر صنعتی کام میں حصہ لینا پڑا اور آجکل ہمیں اگر جاپان کی صنعتی ترقی حیرت خیز معلوم ہوتی ہے ہمیں حکومت کی سرتوڑ کوشش کو کم حیرت و استعجاب کی نظر سے نہیں دیکھنا چاہئے۔ حکومت نے اپنے طلبہ غیر ممالک میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے بھیجے تاکہ وہ صناعت، و تجارت کے جدید طریقوں میں مہارت حاصل کریں اور اُن قوتوں کو جاپان میں رائج کرنے کی کوشش کریں جو یورپ کی صنعتی ترقی کی پشت پر کارفرما ہیں۔ پھر اُس نے غیر ملکیوں کو اپنے کارخانوں کے انتظام اور اُن کی دیکھ بھال کیلئے ملازم رکھا۔ اسکول اور کالج ملک میں قائم کئے جن میں صنعتی اور سائنٹفک تعلیم دی جاتی تھی۔ خود بھی کئی کارخانے بطور نمونے کے جاری کئے مثلاً روئی اور پارچہ بافی کے کارخانے، لوہے اور فولاد کے کارخانے، جہازوں کی ساخت اور ریلوں کے کارخانے پھر اُن کو چلا کر پبلک کمپنیوں کے سپرد کر دیا۔ اسی کے ساتھ اس نے یہ بھی کیا کہ جہاں وہ سرمایہ کے ذریعہ سے براہ راست امداد نہ کر سکی وہاں اُس نے صنّاعین اور تجّار کو محصولوں میں کمی یا ترجیح کے ذریعہ سے امداد دی۔

جاپان میں سرکاری امداد ایک لحاظ سے قابلِ رشک ہے۔ چونکہ وہاں یورپ کی طرح سرمایہ دار موجود نہ تھے اس لئے صنعتی کارخانوں کی ترقی میں کوئی امر حایل نہ ہوا اور نہ وہاں کسی کے مفاد کو نقصان پہونچا برخلاف اس کے جب انگلستان میں صنعتی دور کا آغاز ہوا تو جو لوگ اون کی تجارت کرتے تھے اُن کو فیکٹریوں کی وجہ سے سخت نقصان پہونچا جاپان میں چونکہ اس پیمانہ پر تجارت کرنے والے سرمایہ دار موجود نہ تھے اس لئے کسی خاص جماعت کو نقصان برداشت نہ کرنا پڑا۔

پھر جاپان میں صنعتی انقلاب ایسے وقت میں شروع ہوا جب مغرب میں یہ بہت سے مدارج طے کر چکا تھا اس وجہ سے وہ نہ صرف اچھی باتوں کی نقل کر سکا بلکہ اُن تکالیف اور مصائب سے بھی محفوظ رہ سکا جو بالعموم انقلابات کے آغاز میں لوگوں کو برداشت کرنا پڑتی ہیں۔

جاپان اس لحاظ سے بھی خوش قسمت تھا کہ وہاں جب انقلاب شروع ہوا تو بقیہ ممالک "آزاد تجارت" کے خیال کو چھوڑ کر "تحفظات" اور "امتناعی محصول" کے خیال کی طرف آ رہے تھے۔ جس کا مقابلہ کرنے کے لئے باہمی امداد اور تعاونی ادارے قائم کرنا ضروری تھے۔ جاپان پہلے ہی اپنے مخصوص معاشرتی نظام کی وجہ سے ان باتوں میں ماہر تھا اس لئے اُسے کمپنیوں اور کارخانوں کے اتحاد و قیام میں کوئی خاص مشکل پیش نہ آئی۔

بیان سابق سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ جاپان کا صنعتی ارتقا کیونکر شروع ہوا، لیکن اس کی تفصیل جاننے کے لئے جاپان کی صنعتی تاریخ کو چار ادوار میں تقسیم کرنا چاہئے:۔

(۱) ۱۸۶۸ء سے ۱۸۹۴ء تک
(۲) ۱۸۹۴ء سے ۱۹۱۴ء تک
(۳) ۱۹۱۴ء سے ۱۹۲۶ء تک
(۴) ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۶ء تک

دورِ اول اس زمانہ میں حکومت نے اپنی ساری کوشش "جاپانِ جدید" کی تیاری میں صرف کر دی۔ اسی دور میں پہلی ریلوے لائن تیار کی گئی اور سب سے پہلا بنک قائم کیا گیا۔ صنعتی تعلیم کو رواج دیا گیا اور تجارتی اصول پر جہاز رانی کی ابتدا ہوئی۔ متعدد کارخانے ریشم، روئی، اون، کاغذ اور شیشہ وغیرہ کے قائم کئے گئے اور یہ تمام کام مغربی طرز پر شروع کیا گیا۔ جہازوں کی ساخت اور کان کنی بھی سرکاری انتظام کے ماتحت کی جانے لگی۔ الغرض اس زمانہ کو ہم "سرکاری تنظیم صنعت کا زمانہ" کہہ سکتے ہیں۔

لیکن باوجود ان سب باتوں کے جاپان ابھی تک زرعی ملک تھا اور اس میں صنعت و تجارت زیادہ ترقی پذیر نہیں ہوئی تھی۔ وہ تاحال دھاتیں، کپڑے وغیرہ درآمد کرتا تھا اور اس کی برآمد ریشم، چائے، تانبہ، بانس اور اسی طرح کی دوسری اشیاء خام تک محدود تھیں۔

چونکہ ۱۸۶۸ء کے بعد جاپان کا تعلق غیر ممالک سے ہو گیا تھا اس لئے اس زمانہ کو جاپان کی بین الاقوامی تجارت کا آغاز سمجھنا چاہیئے۔ تجارت زیادہ تر برطانوی جہازوں کے ذریعہ سے کی جاتی تھی۔ امریکہ کے ساتھ ریشم کی تجارت بڑھ گئی، پارچہ بافی کے کارخانے چلانے کے لئے خود ہندوستان، امریکہ اور چین سے روئی خریدی جانے لگی اور اپنی زمین اس نے امریکہ کے بڑھتے ہوئے مطالبہ کو مدنظر رکھتے ہوئے ریشم کی کاشت کے لئے وقف کر دی۔

۱۹۰۵ء میں چین کے ساتھ جنگ نے اس کی صنعت کو بہت فروغ دیا۔ لیکن اس کے بعد قدرتی طور پر کساد بازاری پیدا ہو گئی۔ تاہم بالعموم نئی کمپنیاں اور نئے کارخانے جاری ہوتے گئے اور کاشت غیر معمولی طور پر بڑھ گئی۔

ایک منفرد بات یہ ہوئی کہ دوسرے ممالک کی روش کے خلاف، جاپان نے باہر سے آنے والی اشیاء پر حفاظتی محصول لگایا جس کی وجہ سے اسے خارجی اشیاء کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس میں اس کو نقصان بھی ہوا۔

بہرحال یہ زمانہ جاپان کے لئے قدر سے ترقی اور خوشحالی کا تھا جس کے تین سبب ہیں:-

۱۔ تجارت و صناعت کی سرکاری طور پر امداد
۲۔ چین کے ساتھ جنگ
۳۔ غیر ممالک کے ساتھ تجارتی تعلقات۔

دوسرا دور اس دور کا اہم ترین واقعہ جاپان اور اُس کی جنگ ہے جس میں جاپان کو فتح حاصل ہوئی اور اس کی تجارت چمک اٹھی، جاپانی گورنمنٹ نے اپنی نوآبادیوں سے دھاتوں کے نکالنے کے ادارے قائم کئے اور اس کام کو اعلیٰ پیمانہ پر چلایا گیا۔ ریلوں کو ۱۹۰۷ء میں سرکاری بنا لیا گیا۔ اور تمباکو، نمک اور کپڑے کی تجارت کے لئے بھی سرکاری اجارہ قائم کئے گئے۔ انھوں نے پوری طرح محسوس کر لیا کہ اگر جاپان کو کپڑا سی اور تجارتی ترقی حاصل کرنا ہے تو اسے آہنگری اور مشین سازی کے کارخانے قائم کرنے ضروری ہونگے چنانچہ ۱۹۰۱ء میں سب سے پہلا لوہے اور فولاد کا کارخانہ جاری کیا گیا۔ لیکن بوجہ فقدانِ مواد سکہ وہ کامیابی سے نہ چل سکا۔ اس کے علاوہ حکومت نے اہم صنعتوں کو تحفظات اور ترجیحی محاصل کے ذریعہ سے امداد دی۔

اس کے بعد کئی صنعتوں میں انقلاب پیدا ہوا خصوصاً پارچہ بافی کی صنعت کو کافی فروغ دیا گیا اور مشین سازی۔ آہنگری، برقی رو، اور صنعت و حرفت کی تعلیم کو بہت ترقی دی گئی۔

تیسرا دور یہ دور ترقی جدید کا آغاز تھا۔ اس زمانہ میں غیر معمولی طور پر متعدد نئی اور پرانی صنعتوں کو فروغ ہوا۔ مثلاً روئی، اون، ریشم کی پیداوار بڑھائی اور آہنگری، مشین سازی اور جہاز رانی کے کارخانے زیادہ ہو گئے، کوئلہ بھی کافی مقدار میں نکالا جانے لگا اور برقی رو کا استعمال بڑھ گیا۔

اس غیر معمولی ترقی کی وجہ زیادہ تر ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم تھی۔ جب دوسرے ملک برسرِ پیکار تھے تو جاپان خاموشی سے اس جنگ سے فائدہ اٹھانے میں مصروف تھا یعنی تمام جنگجو اقوام کو اسلحہ اور دیگر اسباب حرب بہم پہونچا کر کثیر نفع حاصل کر رہا تھا۔

اس عرصہ میں خارجی تجارت کی نوعیت بھی بدل گئی۔ یعنی اب بجائے مصنوعات کے وہ صرف مواد فراہم درآمد کرنے لگا اور برآمد میں اشیائے خوردنی کے علاوہ تانبہ اور چائے کی اہمیت بڑھ گئی۔ تجارت کے رُخ میں بھی تبدیلی واقع ہو گئی یعنی بجائے یورپ کے مال زیادہ تر امریکہ اور مشرقی ایشیا میں جانے لگا۔ اور یہی ملک آج کل جاپان کی بہترین منڈیاں ہیں۔ امریکہ میں نہ صرف خام ریشم، چینی کے برتن اور چائے وغیرہ کی زیادہ کھپت ہے جو غیر اہم اشیا ہیں بلکہ وہاں مشینری، دھات کی اشیاء اور روئی کی بھی کافی نکاس ہے۔ ہندوستان اُسے روئی بہم پہونچاتا ہے اور اس کے بدلہ میں سوت اور کپڑے خریدتا ہے۔ مشرقی ایشیا سے وہاں چاول، لکڑی اور کچا لوہا بھیجا جاتا ہے اور اس کے بدلہ میں روئی، کپڑے اور دیگر اشیاء خریدی جاتی ہیں۔

جیسا کہ قاعدہ ہے اس غیر معمولی ترقی کے بعد ۱۹۲۰ء میں جاپان کو کساد بازاری بھی برداشت کرنی پڑی لیکن یہ عارضی تھی اور بہت لوہے اور فولاد کی مشین سازی جہاز رانی اور اُن کی صنعتوں کو کچھ عرصہ بعد

نقصان پہونچا۔ لیکن سب سے بڑا نقصان ۱۹۲۳ء کے شدید زلزلے سے پہونچا جس نے ملک کے تمام معاشی ڈھنچر کو ہلاکر رکھدیا۔

چوتھا دور یہ عرصہ عالمگیر کساد بازاری اور معاشی انتشار کا تھا، لیکن جاپان نے جس حیرت انگیز طریقہ سے اس کا مقابلہ کیا وہ یقیناً قابل تماشا ہے باوجودیکہ مواد خام کی قیمتیں تمام دنیا میں بڑھ گئی ہیں اور صنعتی مصارف بھی زیادہ ہوگئے ہیں لیکن جاپان تاحال اپنی اشیاء تمام دنیا سے سستی بیچ رہا ہے اور خصوصاً ہندوستان میں باوجود غیر معمولی ڈیوٹی کے کامیابی کے ساتھ غیر ملکی اشیاء کا مقابلہ کر رہا ہے۔

مختصر طور پر اس کے چند اسباب یہ ہیں:-

۱- جاپان میں محنت و مزدوری سستی ہے اس لئے خرچہ کم بیٹھتا ہے۔

۲- جاپان نے اقتصادی انحطاط کو پیش نظر رکھکر اپنی کرنسی کی قیمت کو کافی سے زیادہ گرادیا جس کی وجہ سے اسکا زر غیر ملکی کرنسیوں کے مقابلہ میں سستا ہوگیا اور لوگوں کو اشیاء خریدنے کے لئے کم روپیہ دینا پڑتا ہے۔

۳- حکومت کا نظریہ ملک کی صنعتوں کے متعلق ہمدردانہ ہے اور وہ نہ صرف نقد روپیہ یا سرمایہ وغیرہ کے ذریعہ سے بھی ان کی سرپرستی کرتی ہے بلکہ بالواسطہ ٹیکس کے ذریعہ سے بھی ان کی سرپرستی کرتی ہے۔ یہ جذبۂ سرپرستی اس حد تک ترقی کرچکا ہے کہ جاپان نے مقابلہ کی خاطر بعض دیہاتوں کے نام بدلنے بھی منظور کرلئے ہیں۔ مثلاً ایک گاؤں کا نام اس نے برمنگھم صرف اس غرض سے رکھا ہے کہ ولایت کی بائیسکلوں سے خاطر خواہ مقابلہ ہوسکے۔

۴- جاپان کی خود اپنی ضروریات وہ نہیں ہیں جو غیر ملکیوں کی ہیں۔ مثلاً جو کپڑا ان کے یہاں باہر بھیجنے کے لئے بنا جاتا ہے وہ ان کی ملکی منڈیوں میں نہیں کھپتا۔ کیونکہ وہاں کے لوگ اپنے مذاق کے مطابق ایسے کپڑے پہنتے ہیں جو گھروں میں قلیل سرمایہ سے بنائے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح دوسری چیزوں کا حال ہے اس لئے وہ اپنا تمامتر سرمایہ اشیاء برآمد کی خاطر لگا سکتے ہیں۔ اور اس طرح ان کے ابتدائی مصارف بہت کم ہوتے ہیں جسکی وجہ سے مجموعی قیمتیں قلیل ہوجاتی ہیں۔

پس جاپان کے موجودہ صنعتی ارتقاء کا ایک راز یہ ہے کہ وہاں کے لوگوں کی اپنی ضروریات غیر ملکیوں کی ضروریات سے بالکل مختلف ہیں۔ اس لئے جو لوگ برآمد کے کاروبار میں لگے ہوئے ہیں وہ اپنی تمامتر توجہ اشیاء برآمد کی تیاری میں صرف کرسکتے ہیں۔

۵- اگر غور کیا جائے تو جاپان اس مقصد کے حصول کے لئے ہر واجب ناواجب طریق استعمال کرتا ہے مثلاً ارزاں فروشی کا جنون اس حد تک ترقی کرچکا ہے کہ اشیاء کی خصوصیت کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جاتی آپ ایک جاپانی بائیسکل خریدیے وہ چند دنوں کے اندر اندر ذرا سا حادثہ پہونچنے پر بگڑ جائیگی، لیکن ولایت

کی بامیسکل میں برسوں خراب ہونے کا احتمال نہیں۔ بعض مصنفین کے الفاظ میں جاپان اپنے مقصد کے حصول کے لئے غیر ایماندارانہ طریق بھی استعمال کر رہا ہے۔

۶۔ جاپان کا معاشری نظام بھی اس مقصد کے حصول کے لئے اُس کی امداد کرتا ہے۔ مثلاً مقابلہ کی خاطر کسی ملک کا بہترین ہتھیار کمپنیوں اور کارخانوں کی امداد باہمی اور آپس کا تعاون و اتحاد ہے۔ جاپان میں انگلستان کے برعکس اشتراک خاندانی اور جائنٹ فیملی سسٹم کا رواج ہے جس کی وجہ سے وہ بہت جلد متحد ہو کر غیر ملکی اشیاء کا دساور میں مقابلہ کر رہے ہیں۔ یورپ میں شخصیت پسندی کی وجہ سے آپس میں مقابلہ ہو جاتا ہے لیکن جاپان میں یہ ہونا ناممکن ہے کیونکہ خونی رشتہ کی وجہ سے مقابلہ سے احتراز کیا جاتا ہے پس وہ مشترکہ مقصد کے حصول کیلئے متحدہ محاذ قائم کر سکتے ہیں جو مغربی اقوام کو میسر نہیں۔

اس عرصہ میں جاپان کو چین اور روس دونوں سے برسرِ پیکار ہونا پڑا جس کی اصل وجہ جاپان کی بڑھتی ہوئی صنعتی کارروائیاں تھیں جن کو وسیع پیمانے پر پھیلانے کے لئے اس کو ایک کثیر علاقہ درکار تھا۔

پارچہ بافی کے متعلق ہندوستان اور جاپان کا معاہدہ

ایک اور مشہور واقعہ اس زمانہ کا یہ ہے کہ ۱۹۳۴ء میں ہندوستان کا جاپان کے ساتھ پارچہ بافی اور موت وغیرہ کے متعلق ایک اہم معاہدہ ہوا جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

جاپان سے بڑھتے ہوئے تھکنڈوں کو پیشِ نظر رکھ کر ۱۹۳۳ء میں حکومت ہند نے جاپانی پارچہ جات کے خلاف محصول کو پچاس فیصدی سے بڑھا کر پچیتر فیصدی کر دیا۔ جاپان نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ اور ہندوستان کی روئی کا مقاطعہ کر دیا۔ لیکن وہ زیادہ دیر تک اس پالیسی پر قائم نہ رہ سکا کیونکہ امریکہ اور مصر کی روئی نسبتاً مہنگی تھی۔ ۱۹۳۴ء میں جاپان نے سوداؔ کی قیادت میں ایک وفد بھیجا تاکہ وہ حکومت ہند کے ساتھ کسی تجارتی مفاہمت پر پہونچ سکے۔ چنانچہ اُسی سال ایک تجارتی معاہدہ ہو گیا جس کی رو سے جاپان کو اجازت ہو گئی کہ وہ ہر سال بارہ کروڑ پچاس لاکھ گز کپڑا ہندوستان کی منڈیوں میں بھیج سکتا ہے۔ لیکن وہ اس کے بدلہ میں ہندوستان سے کچھ خریدنے پر مجبور نہیں ہوگا اگر کپڑے کی مجموعی لمبائی بتیس کروڑ پچاس لاکھ گز ہو جائے تو وہ ہندوستان سے دس لاکھ گٹھریاں روئی کی خریدنے پر مجبور ہوگا۔ لیکن باہمی تجارت کی آخری حد چالیس کروڑ گز کپڑا جاپان کی طرف سے اور پندرہ لاکھ گٹھریاں ہندوستان کی طرف سے مقرر کی گئیں۔

اس معاہدہ کی رُو سے جاپان نے روئی کا مقاطعہ ترک کر دیا اور ہندوستان نے بھی محصول پچھتر کی بجائے پچاس فیصدی کر دیا۔

ہندوستانیوں نے اس معاہدہ کو مستحسن نہیں سمجھا۔ وہ اس کے خلاف تین اعتراض کرتے ہیں:۔

۱ــ معاہدہ سے قبل جاپان صرف تیس کروڑ میں لاکھ گز کپڑا ہندوستان میں بھیجا کرتا تھا لیکن اب وہ معاہدہ کی رو سے چالیس کروڑ گز کپڑا بھیجا کرے گا۔ اسی طرح معاہدہ سے قبل وہ پندرہ لاکھ ستر ہزار گٹھریاں روئی کی ہندوستان سے خریدا کرتا تھا لیکن اب وہ صرف پندرہ لاکھ خریدا کرے گا۔ پس دونوں لحاظ سے نفع سراسر جاپان کو ہے

۲ــ ہندوستان نے خریدنے کے لئے قیمت مقرر نہیں کی بلکہ صرف گز مقرر کئے ہیں۔ پس جاپان عمدہ عمدہ کپڑے بھیج کر قیمت کے لحاظ سے فائدہ میں رہے گا۔

۳ــ جاپانی مال کی تعداد موجودہ تین کی قیمت کو مدنظر رکھ کر مقرر کی گئی ہے اور تین کی قیمت آجکل بہت گری ہوئی ہے ــ پس ہر حال میں یہ معاہدہ ہندوستانی مفاد کے خلاف ہے۔

عبدالرحیم شبلی - بی - کام

جنوری سنہ ۳۷ء کا نگار

حسب معمول کافی ضخیم ہوگا اور اس کا کل یا اکثر حصہ وقف ہوگا حرف اڈیٹوریل مضامین کے لئے اس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہوگی کہ

ڈرامہ اصحاب کہف

جو طویل ڈرامہ ہے اس میں مکمل شایع کر دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ اور متعدد مضامین اڈیٹر کے قلم کے ہوں گے جن میں ایک فسانہ بھی ہوگا کوشش کی جائے گی کہ بہ حیثیت مجموعی یہ رسالہ جتنا دلچسپ ہو اتنا ہی مفید بھی ہو

منیجر نگار

ڈرامہ اصحاب کہف

چونکہ کتابی صورت میں علیحدہ شایع نہیں ہوگا بلکہ جنوری سنہ ۳۷ء کے نگار میں شامل کیا جائے گا، اس لئے جن حضرات نے اسکی قیمت پیشگی روانہ فرمادی ہے ان سے استصواب کیا جاتا ہے کہ وہ اس کو واپس لینا چاہتے ہیں یا نگار کے حساب میں جمع کرانا پسند فرماتے ہیں۔ اگر وہ چاہیں تو کوئی اور کتاب طلب کر سکتے ہیں۔

منیجر نگار

اگر آپ ہندی شاعری پر سیر حاصل تاریخی و تنقیدی مقالات اور اس کا انتخاب دیکھنا چاہتے ہیں تو نگار جنوری سنہ ۳۶ء ملاحظہ فرمائیے - حجم ۱۲۸ صفحات قیمت ۸ر علاوہ محصول - منیجر نگار

باب الاستفسار

عقل و مذہب

(جناب سعید خلیل الرحمان صاحب - جونپور)

علم و مذہب کی باہمی مخالفت بہت مشہور چیز ہے، اور مذہب کے ہواخواہ کو غلط ٹھہراتا ہے کیونکہ وہ ان کے اصول پر صحیح نہیں اترتے، مذہب علم کو رد کرتا ہے کیونکہ وہ خدا کے وجود کو مسلم کر دینے والا ہے۔ علم کے دلایل تو خیر عقلی ہونا ہی چاہئے، لیکن اب مذہب کو بھی مجبوراً علمی نقطۂ نظر سے جواب دینا پڑتا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مذہب ایسا دلائل کا سیاب ہو سکتا ہے اور کیا واقعی وہ عقلی دلایل ایسے ہو سکتے ہیں جو اہل علم کو خاموش کر سکیں؟ ممنون ہوں گا اگر اس باب میں آپ اپنے خیالات قلمبند فرما کر ہمیں شائع کر دیں۔

(نگار) آپ کے استفسار کے جواب میں اختصاراً اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ "اس وقت تک مذہب اپنی حفاظت میں کوئی عقلی دلیل پیش نہیں کر سکا جو اہل علم کے نزدیک قابل قبول ہو" لیکن چونکہ حکایت لذیذ ہے اس لئے میں اسکو ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتا ہوں۔

ہر چیز میں اس سے قبل "اعتقاد و یقین" کا عنوان قایم کر کے سلسلۂ ملاحظات اس مسئلہ پر کافی بحث کر چکا ہوں لیکن اس وقت میں ایک دوسرے پہلو سے اس پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں اور ایک آدھ مثال پیش کر کے بتاؤنگا کہ مذہب مسئلہ کی دلایل کی نوعیت کیا ہوا کرتی ہے اور اہل علم اسے کیوں تسلیم نہیں کرتے۔

قبل اس کے کہ نفس موضوع پر اظہار خیال کیا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مذہب و علم کے حدود متعین کر دئے جائیں کیونکہ بغیر اس کے فیصلہ دشوار ہوگا۔ لیکن یہ واضح رہے کہ اس جگہ مذہب سے میری مراد کسی جماعت و قوم کی تہذیب (کلچر) نہیں ہے بلکہ صرف وہ معتقدات ہیں جنکا تعلق مابعد الطبیعیات سے ہے یا ان روایات

وواقعات سے جن کو الہام ومعجزہ کے نام سے پیش کیا جاتا ہے۔ اسی میں خدا اور رسول کے مفہوم کو بھی شامل سمجھنا چاہیئے۔ زیادہ واضح الفاظ میں یوں سمجھئے کہ مذہب کا وہ پہلو حریف علم نہیں ہے جو صرف وضعِ قوانین یا تعیین اُصول معاشرت سے وابستہ ہے، بلکہ اس کے وہ بیانات جو حدودِ علم وتحقیق کے اندر آتے ہیں اور جن پر عقل انسانی اچھا یا بُرا ہونے کا نہیں بلکہ صحیح یا غلط ہونے کا حکم لگاتی ہے۔ پھر اگر مذہب نام ہوتا صرف اصلاح اخلاق کا تو یقیناً اس میں اتنی لچک ضرور ہوتی کہ وہ ہر ملک وزمانہ کے لحاظ سے اپنے اندر تبدیلی پیدا کر دیا کرتا اور اس صورت میں علم کے ساتھ اس کا اجتماع کسی نہ کسی مرکز پر بالکل ممکن تھا، لیکن چونکہ مذہب حقیقتاً نام ہے مخصوص معتقدات کا جن پر صرف اس لئے ایمان لایا جاتا ہے کہ وہ خدا کے کسی خاص بندے یا کسی خاص کتاب کے ذریعہ سے حاصل ہوئے ہیں۔ بنابراں علم انھیں حدودِ عقل کے اندر لاکر سمجھنا چاہتا ہے اور جب وہ سمجھ میں نہیں آتے تو انکار کر دیتا ہے اور یہ صورت مذہب وعلم کے مناقشہ کی ایسی ہے جو کسی صورت سے دور نہیں ہو سکتی، کیونکہ اس طرف مذہب کو اصرار ہے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے خدا کا بتایا ہوا کہتا ہے اس میں غلطی کا امکان نہیں اور ادھر علم کہتا ہے کہ خدا نے کچھ نہیں بتایا ایک مخصوص انسان نے اپنے ہی ذہن وعقل کے لحاظ سے بتایا ہے اور اسلئے بلا تحقیق اسے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ پھر اگر مذہبی معتقدات اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایسے ہوتے کہ علم کو اُنکی طرف توجہ کی ضرورت نہ ہوتی تو اس نزاع کے پیدا ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی لیکن مشکل تو یہی ہے کہ مذہب بھی انھیں مسایل پر گفتگو کرتا ہے جن پر علم کی تحقیق جاری ہے اور اس لئے دونوں کا تصادم ناگزیر ہے۔ مثلاً مذہب کہتا ہے کہ خدا نے کائنات کو چھ دن میں پیدا کیا، علم کہتا ہے کہ یہ بالکل غلط ہے کیونکہ کائنات نتیجہ ہے تدریجی ارتقاء کا۔ مذہب کا بیان ہے کہ زمین کی پیدائش پر زیادہ سے زیادہ چند ہزار سال کا زمانہ گزرا ہے، علم کہتا ہے کہ طبقات الارض کا مطالعہ اس کی تردید کرتا ہے اور وہ کروروں بلکہ اربوں سال کی مدت متعین کرتا ہے۔ مذہب کہتا ہے کہ خدا کا ایک نیک بندہ مچھلی کے پیٹ میں تین دن تک زندہ رہا، علم اس کو غیر ممکن بتاتا ہے کیونکہ حیات کے لئے مخصوص اسباب حیات کا پایا جانا ضروری ہے جو مچھلی کے پیٹ میں میسر نہیں آسکتے تھے۔ مذہب مدعی ہے کہ خدا کے کسی برگزیدہ بندہ نے ہاتھ کے اشارہ سے چاند کے دو ٹکڑے کر دئے اور وہ پھر مل گئے علم اس کی تردید کرتا ہے کہ یہ خرق والتیام ممکن نہیں، الغرض اسی طرح کی اور بہت سی باتیں ہیں، جو مذہب کی طرف سے پیش کی جاتی ہیں اور علم ان کے ماننے پر راضی نہیں۔

اب سے کچھ زمانہ قبل جب علوم جدیدہ نے اتنی ترقی نہیں کی تھی اور اس کی تحقیق بھی اتنی زیادہ مکمل نہ تھی، مذہب کی طرف سے عام طور پر جواب کی یہ صورت ہوا کرتی تھی کہ کیا خدا کی قدرت سے بعید ہے کہ وہ ایسا کر دے کیا جس نے آسمان وزمین پیدا کئے ہیں وہ کسی ایک اُصول کی پابندی پر مجبور ہے اور کیا انسان کا علم اتنا وسیع

ہوسکتا ہے کہ وہ قدرت کے نظام اور اس کے اصول پر حاوی ہو سکے۔ جواب کی یہ صورت بہ الفاظ دیگر گویا یہ حیثیت رکھتی تھی کہ ہم عقل و قل کچھ نہیں جانتے اور بلا کسی دلیل کے ہر اس بات کو صحیح باور کرتے ہیں جو مذہب کی طرف سے بتائی گئی ہے، پھر چونکہ علمی تحقیق بھی زیادہ وسیع نہ ہوئی تھی اور انسان کے ذہن سے اس کے عجز کا احساس بھی پوری طرح محو نہ ہوا تھا، یہ بات آگے بڑھنے نہ پاتی تھی اور مذہب اس کو اپنی فتحمندی سے تعبیر کیا کرتا تھا، لیکن اب کہ علوم تکمیل کی حد تک پہونچ گئے ہیں، ہر مسئلہ مشاہدہ کی صورت اختیار کر چکا ہے اور یقین کی ان حدود میں انسان نے قدم رکھا ہے جہاں تذبذب کی گنجایش ہی نہیں ہے۔ مذہب نے اپنی مناظرانہ روش بدلدی ہے اور اب وہ اپنے معتقدات کے ثبوت میں صرف خدا کی مرضی کو دلیل نہیں ٹھہراتا بلکہ علمی نقطۂ نظر سے بھی ان کی صحت پر گفتگو کرنے لگا ہے اور میرے نزدیک مذہب کی سب سے پہلی شکست یہی ہے کہ جن علوم کی صحت کا وہ پہلے منکر تھا اب انھیں کے دامن میں پناہ ڈھونڈھنے کی کوشش کرتا ہے۔

مشرق کا ذکر نہیں جہاں مذہب کیا علم بھی قدامت پرستی کی زنجیروں سے آزاد نہیں، بلکہ مغرب کو دیکھئے کہ وہاں کے اہل مذہب اب اپنے معتقدات کی پیروی میں کیسی کیسی عجیب و غریب علمی دلیلیں پیش کرتے ہیں، درانحالیکہ ان کا یہ علمی دلایل پیش کرنا ہی حقیقتاً ان کے مذہب کی بنیاد کو متزلزل کر دینے والا ہے۔

غالباً نامناسب نہ ہوگا اگر میں اس کی ایک مثال پیش کر کے اپنے مدعا کو زیادہ واضح کرنے کی کوشش کروں۔ روایات توریت و انجیل میں ایک مشہور روایت طوفان و کشتی نوح کی بھی ہے، یعنی کہا جاتا ہے کہ جب طوفان کے آثار شروع ہوئے تو نوح نے ایک کشتی طیار کی جس میں دنیا کے تمام جانوروں کے ایک ایک دو دو جوڑے رکھ لئے چنانچہ موجودہ نسلیں انھیں سے چلی ہیں۔

اس روایت پر علمی نقطۂ نظر سے جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ تمام وحوش و طیور کے جوڑے ایک کشتی میں سما سکیں اور اسی کے ساتھ ان کے لئے ایک سال کی غذا بھی اس میں موجود ہو، چونکہ یہ اعتراض علم ریاضی سے متعلق ہے جس کی صحت کی طرف سے اہل مذہب کو بھی انکار نہیں ہو سکتا اس لئے انھوں نے جو جواب اس کا دیا ہے وہ بھی ریاضی ہی کے ماتحت ہے۔ ملاحظہ ہو

صحیفۂ مقدسہ میں جو پیمایش کشتی نوح کی درج ہے وہ لمبائی، چوڑائی اور عمق کے لحاظ سے علی الترتیب ۳۰۰، ۵۰ اور ۳۰ ہاتھ ہوتی ہے۔ یعنی موجودہ اصول پیمایش کے لحاظ سے وہ ۵۰ء۴ فٹ لمبی، ۵۰ء۷ فٹ چوڑی اور ۵ء۴ فٹ گہری تھی۔ چونکہ روایت سے یہ بھی ثابت ہے کہ اس کے تین درجے تھے اس لئے ایک ایک فٹ درمیانی تختوں کی دبازت نکالکر ہر درجہ یا منزل کی بلندی ۱۴ فٹ ہوئی۔ اب آپ ۵۰ء۴ فٹ لمبائی کو ۵۰ء۷ فٹ چوڑائی سے ضرب دیجئے تو معلوم ہوگا کہ ساری کشتی کا رقبہ ۱۰۱۲۵۰ مربع فٹ تھا اور ہر ہر درجہ کا رقبہ ۳۳۷۵۰ مربع

فٹ گویا دو ایکڑ سے کچھ زیادہ جگہ کشتی میں پائی جاتی تھی۔ اب اسی کے ساتھ موجودہ جہاز سازی کے اصول کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ جہاز کا ہر مربع فٹ ایک ہزار پونڈ وزن کو سنبھال سکتا ہے۔ اس لئے نوح کی کشتی ۳۲۰۰۰ ٹن کا وزن لیجا سکتی تھی۔

جانوروں کی جغرافی تقسیم سب بیان ڈاکٹر الفرڈ رسل یہ ہے کہ دنیا میں ۱۰۰۰ اقسام چوپایوں کی پائی جاتی ہیں، ۱۰۰۸ طیور کی، ۹۸۰ حیوانات سانقہ کی اور ۱۰۰۰۰ کیڑے مکوڑوں کی۔ بائبل کا بیان ہے کہ ہر قسم کے دو دو جوڑے کشتی میں تھے اس لئے اب سوال یہ ہے کہ وہ اس میں کیونکر سما سکے؟

وہ اسٹیم جو جانوروں کو لیجاتے ہیں، ہر گائے کے لئے ۲۰ مربع فٹ جگہ کا انتظام کرتے ہیں لیکن تمام چھوٹے بڑے جانوروں کو ملا کر اوسط ہر جانور کے سائز کا بھی کے برابر ہوتا ہے، اچھا اب فرض کیجئے کہ سب سے نیچے کی منزل چوپایوں کے لئے وقف تھی تو اگر ۱۰ مربع فٹ کا اوسط ہر جانور کے لئے قرار دیا جائے تو اس کے یہ معنے ہوئے کہ اس میں تقریباً ۳۲۰۰ چوپایوں کی جگہ موجود تھی، رہا ان کی غذا کا سامان سو ظاہر ہے کہ چودہ فٹ کی بلند منزل میں جانوروں کی اونچائی کے لحاظ سے اوپر چھت تک کافی جگہ اتنی نکل سکتی ہے کہ اس میں چارہ رکھا جائے۔ اب درمیانی منزل کو لیجئے اور فرض کیجئے کہ وہ حشرات اور حیوانات سانقہ کے لئے رکھی تھی، تو اس کے معنے یہ ہوئے کہ اتنی جگہ میں ۲ لاکھ کیڑے مکوڑے اور ۱۹۶۷ دوسرے حیوانات رکھنے کے بعد بھی کافی جگہ بچ سکتی ہے اگر فی جانور ۲۴ مربع انچ جگہ کا اوسط رکھا جائے اور یہی باقی جگہ ان کی غذا رکھنے کے لئے کام آئی ہوگی، بالائی منزل طیور کے لئے وقف تھی جس میں خود نوح نے بھی معہ اپنے سات ہمراہیوں کے قیام کیا تھا اگر ہر طایر کے لئے اوسط ڈیڑھ مربع فٹ کا رکھا جائے تو اس میں کم از کم ۲۰۱۶۴ چڑیاں رہ سکتی تھیں۔

آپ نے جواب کی صورت دیکھی کہ ریاضی کے حساب سے کتنی نکل سکتی ہے اور نوح کی کشتی میں ہزاروں وحوش وطیور کے سما جانے کو کتنی خوبصورتی سے ثابت کیا ہے۔ پھر ایک خالص مذہبی ذہنیت یقیناً اس کو اپنی فتحمندی قرار دیگی اور بائبل کے اس بیان کو الہام کی صورت سے پیش کرنے میں مطلق تامل نہ کریگی، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ایک علمی میلان رکھنے والا انسان اس جواب سے مطمئن ہو سکتا ہے اور یہ بیان سنکر کیا اسے واقعی یقین آگیا ہوگا کہ نوح کی کشتی میں ضرور تمام دنیا کے جانور پائے جاتے تھے؟ ہرگز نہیں۔

جواب دینے والے نے اس مسئلہ میں صرف کشتی کی وسعت کے مسئلہ کو لے لیا لیکن یہ نہ دیکھا کہ من حیث الکل اس روایت میں اور کتنی باتیں ایسی ہیں جو عقل کے نزدیک قابل قبول نہیں ہیں۔ اگر اسے تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کر لیا جائے کہ نوح نے واقعی اتنی بڑی کشتی بنائی تھی جس میں لاکھوں جوڑے وحوش وطیور کے آسکیں تو بھی یہ سوال بدستور اپنی جگہ قایم رہتا ہے کہ وہ تمام دنیا کے وحوش وطیور کو ایک جگہ فراہم کیونکر کر سکے۔

کہدیجئے کہ کیا انسان جانوروں کو سدھا نہیں سکتا اور کیا سرکس میں ہم اس طرح کے تماشے روز نہیں دیکھتے کہ صرف ایک آواز پر جانور دوڑے چلے آتے ہیں۔ یقیناً یہ جواب بھی قرین عقل ہے۔ اب تیسرے اعتراض کو لیجئے اور وہ یہ کہ وحوش و طیور میں بہت سے ایسے جانور پائے جاتے ہیں جو ایک دوسرے کے دشمن ہیں پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ سب ایک جگہ امن و آشتی کے ساتھ رہ سکیں۔ جواب کی اسی ذہنیت کو پیش نظر رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ انسان میں اتنی قوت مقناطیسی علوم جدیدہ کی رو سے ثابت ہو چکی ہے کہ وہ اپنی قوت ارادی سے کام لیکر دوسرے کو کسی خاص میلان کی طرف مجبور کر سکے اس لئے اگر نوح نے جانوروں سے انکی طبعی خصوصیات کو چند دنوں کے لئے معطل کر دیا ہو تو اس میں کونسا استحالہ عقلی ہے۔ پہلے قصہ ختم ہوا اور کشتی نوح کی روایت دلایل عقلی سے ثابت ہو گئی۔ لیکن آیئے ان دلایل کی بنا پر ایک بار پھر غور کریں کہ جواب کی صورت کیا ہوئی؟ صرف یہ کہ:-

۱- حضرت نوح بہت بڑے عالم حیوانات تھے اور ان کو معلوم تھا کہ دنیا میں اتنی قسم کے جانور پائے جاتے ہیں۔

۲- حضرت نوح بڑے زبردست ریاضی داں تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ اتنے جانوروں کے لئے اتنی جگہ کافی ہوگی اور اسی حساب سے انھوں نے کشتی تیار کی

۳- حضرت نوح جانوروں کے سدھانے میں کمال رکھتے تھے یہاں تک کہ کشتی میں بیٹھے بیٹھے انھوں نے درندوں، چوپایوں، چڑیوں اور کیڑے مکوڑوں کو بلا لیا۔

۴- حضرت نوح ایک ماہر مسمریزم تھے کہ انھوں نے تمام جانوروں کو اپنی مقناطیسی قوت سے مغلوب کر کے ان کی طبعی خصوصیات و زندگی کو چھین لیا تھا۔

یقیناً ہمیں اس جواب پر یہ اعتراض کرنے کا حق حاصل نہیں کہ حضرت نوح نے یہ تمام علوم کبھی اور کہاں حاصل کئے تھے، کیونکہ بہر حال انسان ہی یہ سب کچھ حاصل کرتا ہے، لیکن اس اعتراض کا جواب اہل مذاہب کے پاس کیا ہے کہ اگر ہم حضرت نوح کی ان تمام کامیابیوں کو صرف علمی کامیابی قرار دیں تو پھر انکی نبوت کے ثبوت میں کیا چیز پیش کی جائے گی اور ان کی مذہبی برگزیدگی ثابت کرنے کے لئے کس دلیل سے کام لیا جائے گا۔ کیونکہ اگر محض علم یا سائنس کی رو سے کسی عجیب امر کا ظہور نبوت کا ثبوت ہو سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس زمانہ میں ہم اڈیسن کو سب سے بڑا پیغمبر نہ قرار دیں، درانحالیکہ کوئی ان مذہب ایسا سمجھنے پر راضی نہیں ہو سکتا۔

اس سے قبل میں نے عرض کیا تھا کہ موجودہ اہل مذاہب کی یہ ذہنیت کہ وہ اعتراضات کا جواب علمی نظریوں کے سامنے رکھ کر دینا چاہتے ہیں، مذہب کی اتنی بڑی شکست ہے کہ اس کے بعد وہ کسی طرح

جانبر ہو ہی نہیں سکتا، چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک کشتی نوح کی روایت ثابت کرنے کے لئے اہلِ مذاہب نے جو علمی دلایل پیش کئے ہیں ان سے ممکن ہے روایت تو ثابت ہو گئی ہو، لیکن جناب نوح کی رسالت و نبوت بالکل ختم ہو جاتی ہے۔

ایک رسول کی رسالت کا تعلق صرف اس عقیدہ سے ہے کہ جو کچھ وہ کرتا ہے منجانب اللہ کرتا ہے اور اس میں کسی اکتساب یا جد و جہد کا دخل نہیں ہوتا پھر چونکہ علمی توجیہات میں اس اکتساب کا ماننا ضروری ہے اس لئے علوم اکتسابیہ اور علم نبوت کا اجتماع تو کسی طرح ممکن ہی نہیں۔ ہاں اگر یہ کہا جائے کہ ایک پیغمبر دنیا کے تمام علوم کی مہارت ماں کے پیٹ سے لیکر پیدا ہوتا ہے تو بیشک یہ صورت ایک مخصوص امتیاز کی پیدا ہو سکتی ہے، لیکن اس دعوے کو کس علمی توجیہہ سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اگر اہلِ مذاہب ایسا کہیں بھی تو اسے مانتا کون ہے اور وہ اسے منوا بھی کیسے سکتے ہیں۔

مذہب نام ہے صرف کورانہ و جاہلانہ انقیاد و اطاعت کا اس لئے اس کا وجود، خواہ وہ ضروری ہو یا غیر ضروری مفید ہو یا غیر مفید، صرف اسی طرح قایم رہ سکتا ہے کہ وہ اسی جہل و لاعلمی کی دنیا میں رہے۔ علم کے میدان میں اسکی تگ و دو حد درجہ نامقبول جسارت ہے کیونکہ یہیں آکر سب سے پہلے اس کے پائے لنگ کا حال لوگوں پر کھلتا ہے اور وہ ایک مضحکہ خیز چیز بن جاتا ہے۔

میں ان اہلِ مذاہب کو اچھا سمجھتا ہوں جو کسی علمی برہان و حجت کو اپنے پاس آنے ہی نہیں دیتے اور خدا کو صرف "بلا دلیل" پہچاننے کے مدعی ہیں، کیونکہ اس کے اندر ایک ایسا عزم راسخ پنہاں ہے کہ اس کے مقابلہ میں علم کو بھی خاموش رہ جانا پڑتا ہے۔ لیکن وہ حضرات جو اپنے عقاید کی صحت میں عقلی دلایل پیش کرنے کی جرأت کرتے ہیں، وہ حقیقتاً وہی ہیں جو مذہب کی طرف سے مطمئن بھی نہیں ہیں اور اس کے ترک کر دینے کی جرأت بھی اپنے اندر نہیں پاتے۔ یہ مذہب کے نہایت خطرناک دوست ہیں اور ایک نہ ایک دن انھیں دوستوں کی بدولت دنیا سے مذہب کو ختم ہو جانا ہے۔

مشرقی عظمت کا علم بردار

"جاپان"

مصنفہ۔ جناب چمن لال صاحب جرنلسٹ (سیاح جاپان) مترجمہ فقشی محمود علی صاحب (جامعی) آج سے صرف ۸۰ برس پہلے جاپان جس سے اب ایشیا کا نام روشن ہے بالکل گمنامی میں پڑا تھا۔ لیکن اس مختصر مدت میں اس نے وہ حیرت انگیز ترقی کی ہے کہ اس کا شمار دنیا کی زبردست طاقتوں میں ہونے لگا ہے۔ اس انقلاب کی داستان اس زبردست تصنیف میں ملاحظہ کیجئے، یہ کوئی سفرنامہ نہیں کہ چند واقعات پر ایک سرسری نظر ڈالی گئی ہو بلکہ ایک مبصرانہ تصنیف ہے جس میں تمام حالات کا غائر مطالعہ اور جاپان کے عروج پر مفصل بحث ہے مصنف نے ساری کتاب میں یہ بات پیش نظر رکھی ہے کہ ہمارا ملک جاپان سے کیا سیکھ سکتا ہے ـــــ سائز 18×22 ضخامت ۲۲۵ صفحات کاغذ ۴۲ پونڈ، کتابت طباعت عمدہ، مروق خوبصورت۔ ۱۱ تصاویر غیر مجلد قیمت عہ، ۴۰ تصاویر مجلد قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ۔ مکتبہ جامعہ دہلی

باب المراسلۃ

ذیل کا مکتوب جمیل میرے ایک نہایت عزیز دوست کا ہے جن سے میں صرف اس لئے محبت کرتا ہوں کہ اگر کبھی اپنی مولویت کی "صراطِ مستقیم" سے ہٹنے کی توفیق ان کو میسر آگئی تو وہ اُس بلند قسم کے "رند بجرو" ثابت ہوں گے جنھیں عراقی اپنی زبان میں "خاصگانِ مائی" سے تعبیر کرتا ہے۔

ایک سال سے زاید زمانہ گزرا کہ ان کی بیوی چند چھوٹے بچے چھوڑ کر انتقال کر گئیں، ہر چند ایک مولوی کی نگاہ میں بیوی اور "مالکت ایمانہم" ایک ہی سلسلۂ نشاط کی دو کڑیاں ہیں اور اس باب میں اس کا نظریہ "اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا" سے آگے نہیں بڑھتا، لیکن جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہمارے عزیز دوست میں چونکہ "جراثیم رندی" بھی کافی پائے جاتے ہیں، خواہ وہ فی الحال کتنے ہی ساکن (Inactive) کیوں نہ ہوں، اس لئے انھیں اس حادثہ سے سخت صدمہ پہونچا اور انھوں نے مجھے ایک خط لکھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اب اپنی زندگی سے بھی بیزار ہیں چہ جائیکہ "نشاطِ زندگی"۔ میں نے لکھا کہ یہ تاثرات عارضی ہوا کرتے ہیں اور خصوصیت کے ساتھ زمانۂ شباب میں کہ اس وقت تو ان کی پایداری گریۂ شبنم سے بھی زیادہ بے حقیقت ہوتی ہے اس لئے آپ فوراً دوسری شادی کر لیجئے، انھوں نے اسے "خیالِ محال" سے تعبیر کیا اور اعلان کر دیا کہ اپنی بقیہ عمر وہ "مرحومہ" کی یاد میں بسر کر دیں گے اور اس "جانہاری" کے ان وداعی الفاظ کو کبھی فراموش نہ کریں گے جن میں نہایت حسرت کے ساتھ ان کے جدید حیات ازدواجی کا ذکر کیا گیا تھا۔

بات آئی گئی ہوئی، میں بھی اپنی الجھنوں میں پڑ گیا اور وہ بھی "جرِ حیات" کے مشاغل میں مصروف ہو گئے کبھی کبھی اگر خیال بھی آتا تھا تو میں اس کو ٹالدیا کرتا تھا کیونکہ ان کی سوگوارانہ زندگی کا تصور میرے لئے باعث اذیت تھا

اتفاق سے حال ہی میں ان کی ایک تحریر اور آئی اور یہ غیر متوقع خبر لیکر آئی کہ انھوں نے دوسرا نکاح کر لیا ہے، خط کے الفاظ سے معلوم ہوتا تھا کہ انھیں غیر معمولی مسرت و انبساط حاصل ہے اور گزشتہ عہد و پیمان کی یاد تک باقی نہیں رہی۔ میں نے اُن کو اس "نشاطِ جدید" پر مبارکباد دی، انھوں نے شاید اس میں ایک طعن بھی محسوس کیا اور مجھے دوسرا مفصل خط بھیجا۔ چونکہ اس تحریر سے نہ صرف نفسیات شباب و ازدواج پر روشنی پڑتی ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جذبات جنسی کس حد تک انسان کی ذہنیت بدل دیتے ہیں۔ اس لئے

نگار میں شایع کرتا ہوں اور اس کا جواب بھی نگار ہی کے ذریعہ سے دینا پسند کرتا ہوں ——— نیاز

مخدومی ، السلام علیکم

سچ ہے "نشاط جدید" بھی ہے اور "نشاۃ جدیدہ" بھی، آپ کے "شاعر کا انجام" بے طرح یاد آجایا کرتا ہے، جب افضال کو کوئی یہ کہکر ریشمی چادر سرہانے ڈال دیتا تھا کہ "چلو ہوگا"، درانحالیکہ اس وقت دق کے بارہ بج رہے ہوتے تھے، آپ کا ہیرو ایک خط لکھتا ہے اور اس میں گل و ریحان کی نکہت، چاند کی ضیا پاشی، باد نسیم کی مستانہ وشی، الغرض کائنات کی ساری جمالیاتی فضا کو کسی ہستی میں سمٹا ہوا دیکھتا ہے اس کے پاس الفاظ ناکافی ہیں اور وہ اپنے مخاطب کے اندر ایقانی کیفیت بھی پیدا کرنا چاہتا ہے وہ عالم واگزاشتگی میں اپنے دوست کو آنے کی دعوت دیتا ہے، تاکہ فطرت کے ان لطائف فراواں کا نزدیک سے خود مطالعہ کرے، آپ کے باب میں کیا عرض کروں جس کے لئے لکھنؤ "ہمت و توفیق" کے اثر سے بہت بلند چیز ہو کر رہ گیا ہے۔ اور آپ مشکل ہی سے اپنے زاویہ شب زندہ داری سے باہر قدم نکالنا پسند کرتے ہیں ، آج سے ڈھائی ماہ قبل ..... صاحب کو ایک خط لکھا تھا، اب اس خبر سی آتی ہے، کیا کچھ نہیں حسرت و ارمان کا رونا رویا گیا۔ آپ جانتے ہیں مجھے میر و درد، قائم و ضیا سے کس قدر لگاؤ ہے، انھیں شہیدان درد کے اشعار میری زبان پر چڑھے ہوئے ہیں۔ داغ کی شاعری، اور ریاض کے افکار سے میرے دل میں کوئی ابھار پیدا ہونے کے بجائے، ایک کمزوہ اجنبیت معلوم ہوتی تھی، لیکن اب کہ آپ کے الفاظ میں میرا "دور نشاط" ہے، اکثر ریاض کا یہ شعر پڑھتا ہوں :۔

میں ڈراتا ہوں یہ کہہ کہکے حسینوں کو ریاض جو نہ پورا ہو وہ ارمان مرے دل میں نہیں

میں جانتا ہوں آپ یہ سطور پڑھ رہے ہوں گے اور مسکراتے جاتے ہوں گے لیکن ہاں اس خلش کے نکل جانے کے خیال سے آپ کو ہم پر ہنسی آرہی ہوگی، جس کی پیشینگوئی آپ نے اپنے خط میں کی تھی، اچھا تو کچھ اور ہنس لیں ایک شعر اور سناتا ہوں :۔

وصل کی شب نہ چلی ایک بھی شوخی ان کی کچھ نہ بن آئی تو چپکے سے کہا مان گئے

انسان کا ہر "حال"، خواہ کتنا ہی غم آگیں ہو، یا کتنا ہی طرب انگیز اس کی ناپایداری مسلم ہے اور اسی لئے اپنے مقدر پر کبھی ہنسی آتی ہے۔ اور کبھی رونے کو جی چاہتا ہے، کاش محسن اکبر آبادی کا یہ شعر زندگی کی حقیقت ہوتا

محسن تمام عمر مجھے رونے ہی کٹی اس نکتہ میں آہ کہیں بھی سرور ہے

لیکن کیا کیجئے یہاں تو ہر کیفیت اپنی ایک دھندلی سی یاد چھوڑ کر مٹ جاتی ہے، خواجہ میر درد نے بڑی آہ سے کہا تھا:۔

رونے سے ہے نقش پا کی طرح خلق میں مجھے اے عمر رفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے

مگر مصیبت تو یہ ہے کہ "نقش پا" میں بھی اتنی پائیداری کہاں کہ وہ خلق کے روندنے تک منزل فنا سے ہم آغوش نہ ہو جائے، کہاں تو میر و ضیا کا درد، اور کہاں ریاض مرحوم کی بیزاری۔

کہتے ہیں جان پڑ گئی آفت میں وقت وصل مل دل کے رکھ دیا مجھے اچھا یہ پیار ہے

اچھا ابتک تو محض معاملات حاضرہ کے ایک ابتہاجی پہلو پر اظہار خیال کیا گیا جس میں ایک حد تک شاعرانہ افترا بھی سمجھ لیجئے، حقیقت یہ ہے کہ میری کوئی خوشی غم سے خالی نہیں رہی، اور غالباً یہ ایک نفسیاتی حقیقت بھی ہے کہ دنیا میں "غم روزگار" اور "غم عشق" توام ہیں آپ نے میرے اس دور کو "عہد نشاط" سے یاد فرمایا، ہاں ایک حد تک آپ کا یہ خیال صحیح بھی ہو سکتا ہے لیکن میں کیا بتاؤں کہ اس کو "ایام احتیاط" سے تعبیر کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ سارا ایکٹ پر مولویوں کی چیخ پکار اور آپ کی چیئر نگار کے صفحات میں پڑھ چکا ہوں، ہاں ایک مولوی، عشق پیرانہ سری کی بنا پر کب گوارا کر سکتا ہے، "تلاعبها و تلاعبک" کے نشاط کار سے محروم ہو جائے، یقیناً ہمارے شب زندہ دارانہ ایام میں ایک سنجیدہ ٹھہراؤ پیدا ہو گیا ہے اور یہ وہ عہد ہے جبکہ مرد و جزر میں سے کسی کا تصور اطلاق نہیں ہو سکتا، لیکن ہوں پھر بھی اسی "برگزیدہ" جماعت کا ایک فرد اس لئے "ایک حسین ہر وقت ہوان کے منانے کے لئے" کسی دل والے نے کہا تھا

نہ وہ تم رہے نہ وہ میں رہا نہ وہ دن رہے نہ وہ دم رہے نہ تمہیں امید طفولیت نہ ہمیں امید شباب ہے

ماضی کی یہ سوگوارانہ یاد کس قدر اثر آفریں ہے، حسرت کی بھی کوئی غایت ہے! لیکن آپ سے پوچھتا ہوں کہ جہاں "طفولیت" اور "سن شباب" سے سابقہ ہو تب ہو اس عہد کو کسی نے "جوانی کی راتیں اور مرادوں کے دن" سے تعبیر کیا ہے، لیکن میں تو اس منزل پر ہوں کہ اب "چیئر" سے زیادہ "تکمیل" کی آرزو رہی ہے، اور "سرشاری" سے زیادہ "خمار" کی طلب۔ اسی وجہ سے ایک کرفت سی رہی مگر اب اس میں بھی سکون ہے، میر تقی کا شعر ہے

ہم اسیروں کو بھلا کیا جو بہار آئے نسیم عمر گزری کہ وہ گلزار کا جانا ہی گیا،

لیکن میں تو صرف "امید بہار" ہی پر جیتا ہوں، اور ریاض مرحوم ہمت زیست دلا رہے ہیں۔

نہ رہنے پائے بلبل جی کی جی میں کہ اب رس آ چلا ہے ہر کلی میں

امید کی یہ تمثیل میں نے خود مول لیں۔ آپ کا مشورہ تھا، اور مجھ کو ایک سوگوارانہ یاد مقصود تھی

ہاں کبھی کبھی تذکرہ آتا ہے اور دونوں اُن کو یاد کرکے آنسو کے چند قطرے ٹپکا لیتے ہیں۔ دل ہلکا ہوجاتا ہے، بچوں کے ساتھ بھی اچھا سلوک ہے، پہلے جس لفظ سے بچے پکارتے تھے اب بھی وہی لفظ استعمال کیا جاتا ہے، مرحومہ کی یاد پر رشک و رقابت کی جگہ یاس و حسرت کا اظہار ہوتا ہے، مجھے بڑی حد تک اطمینان حاصل ہے۔

لکھنؤ — ۱۵ اپریل ۳۶ء

صدیقی الاغر — آپ کا جواب مجھے اسوقت ملا جب میں قطعاً اس کی طرف سے مایوس ہوچکا تھا اور اپنی اس مایوسی پر قانع بھی تھا کیونکہ جب ایک شخص زندگی کے اس دور سے گزر رہا ہو جسے

جہانے مختصر خواہم کہ در روئے ہمیں جائے من دجائے تو باشد ——— کہتے ہیں

تو ایسے وقت میں اس کو چھیڑا ہی کیوں جائے۔ میں سمجھتا تھا کہ میں نے بالکل بے محل تقاضۂ جواب کیا ہے اور اگر آپ اب بھی خاموش رہتے تو میں کبھی آپ کو ملامت نہ کرتا، کیونکہ نتیجہ معلوم —

وبشدورژن قال :— احد الملامۃ فی ہواک لذیذۃ

حبالذکرک فلیمنی اللیوم

آپ کی اس تحریر کو پڑھکر اپنی اور دوسروں کی زندگی کے بہت سے وہ تجربات سامنے آگئے جن کا اگر تجزیہ کیا جائے تو "فریب نفس" سے زیادہ اور کچھ نہیں ٹھہرتے۔ انسان اور خصوصیت کے ساتھ ایک پڑھے لکھے ذہین انسان کی یہ خصوصیت کہ وہ معصیت کے باب میں بھی "اطمینان ضمیر" کی کوشش سے باز نہیں آتا، گو خالص مذہب کی پیداوار ہے، لیکن ہے نہایت پُرلطف — آپ کو معلوم ہے کہ میں کیوں اسے "پرلطف" کہتا ہوں؟ اسلئے نہیں کہ گناہ کو "صواب" سمجھ کر کرنا کوئی معقول بات ہے بلکہ صرف اس لئے کہ اس طرح "ارتکاب گناہ" میں جو ایک کیفیت "دزدیدہ نگاہی" کی پیدا ہوجاتی ہے وہ بڑی جمیل چیز ہے۔ خیر، یہ تو میں نے اس لئے لکھدیا کہ آپ پر اسوقت مجھے معلوم نہیں کیوں، تھوڑا سا رشک آگیا ورنہ میں کہ اب گناہ کو "گناہ" سمجھ کر کرنے کا عادی ہوں اور وہ بھی پوری طرح ضمیر کا خون کرنے کے بعد۔ اب اس قسم کی لذتوں سے اس حد تک بیگانہ ہوچکا ہوں کہ سوائے اپنے سب کو "گناہگار" سمجھنے لگا ہوں۔

مرد و عورت کے تعلقات جنسی کے سلسلہ میں سب سے زیادہ غیر شاعرانہ چیز شادی یا نکاح ہے اور خصوصیت کے ساتھ اس وقت جب اس میں "مولویت" بھی شامل ہو کہ اس صورت میں تو وہ بالکل بازار کا سا سودا ہوکر رہجاتی ہے یونتو ایک رند کی بیوی بھی عورت ہونے کے لحاظ سے کوئی خاص چیز نہیں، تاہم بہ لحاظ احترام رندی وہ اس کو محبوب سمجھنے کی کوشش ضرور کرتا ہے، لیکن ایک مولوی جو اپنی بیوی سے بجز اس کے کوئی توقع نہیں

رکھتا کہ نماز سے جو وقت بچے وہ شوہر کی خدمت میں صرف ہونا چاہئے، کیا خاک اس کی قدر کر سکتا ہے۔ اگر اولاد ہونے سے قبل وہ مر جاتی ہے تو ایک خادمہ کے چلے جانے کا رنج ہوتا ہے اور اولاد چھوڑ گئی تو ایک دایہ مرضعہ کی حیثیت سے اس کے اُٹھ جانے کی تکلیف ہوتی ہے۔

ہر چند مولوی نہ ہونا، رند ہونا نہیں ہے، لیکن جو رند نہیں ہے وہ مولوی یقیناً ہے، اسی حیثیت سے میں آپ کو مولوی سمجھتا ہوں، اور اسی بنا پر میں نے آپ کو مشورہ دیا تھا کہ آپ فوراً دوسرا عقد کر لیجئے کیونکہ مجھے معلوم تھا یہ صدمہ و تاثر جس کا تعلق بیوی نہیں بلکہ "بچوں کی ماں" کے اُٹھ جانے سے ہے بالکل عارضی چیز ہے اور ہمیشہ اسکا مداوا "نکاح ثانی" سے کیا جاتا ہے خواہ وہ کامیاب ثابت ہو یا ناکام۔

آپ نے اس کا جواب ایک ایسی "رندانہ خودسری" سے دیا کہ جی خوش ہو گیا، حالانکہ اس پر عزم و ثبات کا زیادہ یقین مجھے نہ تھا۔ ایک زمانہ گزر گیا اور میں یہی سمجھتا رہا کہ ممکن ہے آپ کی سوگواریاں بدستور قایم ہوں، لیکن حال ہی میں آپ کی تحریر نے اس پردہ کو بھی اُٹھا دیا اور مجھے یہ سنکر کہ آپ نے دوسری شادی کر لی اطمینان بھی ہوا اور حیرت بھی ہوئی۔ اطمینان اس لئے کہ یہ زمانہ "عشق و جنون" کے لئے سازگار ہی نہیں، گو آپ کی عمر اس کی مقتضی ہو اور حیرت اس لئے کہ آپ کے لب و لہجہ سے یہ بھی مترشح ہوتا تھا کہ یہ محض نکاح ہی نہیں ہے بلکہ رومان بھی ہے۔

میں نے آپ کو اس "نشاط تازہ" پر مبارکباد دی، لیکن آپ نے غالباً اس میں کچھ طعن بھی محسوس کیا اور اس کے جواب میں کافی تامل اور پس و پیش کے بعد یہ "انتقاد نامہ" روانہ فرمایا۔

باور کیجئے کہ آپ کے نکاح ثانی سے جتنی مجھے خوشی ہوئی کسی اور کو نہیں ہو سکتی، کیونکہ میں اسکی پیشین گوئی کر چکا تھا، آپ کو مشورہ دے چکا تھا اور حقیقتاً آپ کے لئے ضروری بھی جانتا تھا۔

آپ نے اپنی موجودہ حیات ازدواج کا ذکر جن الفاظ میں کیا ہے ہر چند ان سے ایک خاص قسم کا نشہ ضرور ٹپکتا ہے لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ اس میں کچھ "اندیشۂ نیش" بھی شامل ہے۔ اگر پہلی بیوی کے انتقال کے بعد اتنا زمانہ حسرت و یاس میں بسر کر دینا خلاف عقل تھا تو اب نکاح ثانی کے بعد اس کی تلاش کو باقی رہنے دینا اس سے زیادہ بُرا ہے۔ آپ کی زندگی کے پہلے حصہ میں جب دوسری بیوی شریک نہ تھی تو دوسرے حصہ میں پہلی بیوی کیوں شامل ہو۔ کیا آپ اپنے دو ٹکڑے برابر کے ایسے نہیں کر سکتے کہ ان میں کمی و بیشی کا سوال ہی نہ پیدا ہو سکے۔

ہر چند آپ نے وضاحت کے ساتھ تو نہیں لیکن اجمالاً ضرور اس تفاوت کو ظاہر کیا ہے جو آپ کی اور اُن کی عمر میں پایا جاتا ہے۔ اس کے متعلق میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ایسی صورت میں دلداریوں

کی ذمہ داری زیادہ تر آپ ہی پر عاید ہوتی ہے اس میں شک نہیں کہ ۔ غنچہ تا شگفتنہا قدر عافیت معلوم! کا احساس نہایت تکلیف دہ ہے لیکن زن وشو کے باب میں اس کا متشائم پہلو بھی عورت ہی کے احساس سے تعلق رکھتا ہے، کیونکہ مرد اپنی کمزوریوں کے چھپانے میں کمال رکھتا ہے اور اس حد تک جری واقع ہوا ہے کہ اگر پھول کی خوشبو ان کو محسوس نہ ہوگی تو غصہ میں آکر اسی کو "بے بو" کہکر مسل ڈالیگا اور اپنے ضعف شامہ کو کبھی نہ ظاہر ہونے دیگا۔ آہ، آپ کیا پوچھتے ہیں کہ ہندوستان کی عورت کتنی مظلوم ہے۔ اس سے مطالبہ جاتا ہے کہ وہ اپنے جذبات کا خون بھی کرے اور مسکراتی بھی رہے!

یاد کیجئے کہ اس جدید تعلق سے جو تغیر آپ کے جذبات میں پیدا ہوا ہے اس کو معلوم کرکے میں خوش ہوا، اس لئے نہیں کہ آپ اب بجائے میر و درد کے داغ و ریاض کی دنیا میں آگئے ہیں، بلکہ صرف اس بنا پر کہ سن و قوت میں "گہے طفلے شود مستانہ می رقص" اس بات کی علامت ہے کہ انسان زیادہ زندہ رہنا چاہتا ہے اور یہ آپ جانتے ہی ہیں کہ میں آپ کو کم از کم اس وقت تک ضرور زندہ رکھنا چاہتا ہوں جب تک میں موت کے خیال کو بھلائے ہوئے ہوں۔

یہ درست ہے کہ "انسان کا ہر حال خواہ وہ غم آگیں ہو یا طرب انگیز اس کی ناپایداری مسلم ہے" لیکن سوال یہ ہے کہ انسان اس فکر میں اپنا سر کیوں کھپائے۔ طلوعِ ماہ کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا صرف اسلئے کہ اسے غروب بھی ہونا ہے یقیناً کوئی فطری مطالبہ نہیں۔ غالب نے اس فلسفہ کو ایک نہایت لطیف و نازک طنزیاتی پیرایہ میں اس طرح بیان کیا ہے:-

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز
دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز

انسان خواہ کتنی ہی عمر لیکر آئے لیکن وہ زندہ رہتا ہے زیادہ سے زیادہ پندرہ سال۔ بیس سے پینتیس تک۔ پھر فطرت کے اس بخل سے انتقام لینے کی صورت یہی ہے کہ اس کی طرف سے یکسر روگردانی اختیار کر لیجائے۔ "القارعۃ" پڑھ پڑھکر آنسو بہاتے رہئے اور "اذا زلزلت الارض زلزالہا" کے خیال سے کانپتے رہنے کی عمر ابھی آپ کی نہیں آئی ہے۔ اور پھر یوں بھی طاعت و عبادت یا حسن اخلاق کا یہ مفہوم میری سمجھ میں کبھی نہیں آیا کہ خدا کو نعوذ باللہ "بیچا" سمجھ لیا جائے۔ آپ جانتے ہیں کہ میرا خدا صرف "رحمان و رحیم" ہے، میں شراب پیتا ہوں وہ مسکرا کر منہ پھیر لیتا ہے، میں بدمستی کرتا ہوں وہ ٹالجاتا ہے، میں جتنا اس کی طرف سے بے پرواہ رہتا ہوں اتنی ہی زیادہ پرواہ وہ میری کرتا ہے۔

او خود مگر بہ لطف خداوندی کند
ورنہ زما چہ بندگی آید پسند او

آپ نمازیں پڑھئے لیکن نماز کا "سوگ" اپنے اوپر کبھی نہ طاری ہونے دیجئے۔ آپ جتنی زیادہ نماز پڑھتے ہیں اتنا ہی زیادہ حق آپ کو خدا کے بھلا دینے کا حاصل ہے — خدا کو بھلا دینے کے معنے اس کے قہر و غضب سے مطمئن ہو جانے کے ہیں — آپ داڑھی بڑھائیے لیکن صرف چہرہ پر، سینہ کے اندر نہیں کہ اسکی سیاہی قلب پر چھا جائے۔ خیر تو مدعا یہ کہنا تھا کہ جب ہر چیز کی ناپایداری مسلم ہے تو مسرت کی گھڑیوں کو فکر غم سے تباہ کرنا فطرت کا اقتضا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے شب وصل کی شوخیوں کا ذکر کرتے ہوئے آپ کا "غمگدہ اور آہ" کو یاد کرنا مجھے پسند نہیں آیا۔ چونکہ آپ پر کبھی رندی کا دور نہیں آیا اس لئے آپ "رندانہ اخلاق" کی بلندی سے بھی واقف نہیں، میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں رندی کی ابتدا ہوتی ہے اپنے آپ کو بھلا دینے سے اور اس کا اختتام ہوتا ہے اپنے آپ کو مٹا دینے پر دوسروں کے لئے۔ آپ کو معلوم ہے اسوقت وہ دوسرا کون ہے جو آپ سے اس "رندانہ رواداری" کا طالب ہے۔ آپ کی بیوی! — اگر میں نے آپ کی موجودہ زندگی کو "عہد نشاط" کہا تو یہ میرا اک نوع کا ایعاز و اشارہ (Suggestion) تھا نہ کہ طنز و استہزا۔ آپ نے کیوں وہ باتیں لکھیں جن کو میں سننا پسند نہیں کرتا۔ ابھی تو ابتدا ہے، اگر ابھی سے آپ نے کراہنا شروع کیا تو آئندہ کیا کیجئے گا۔

مسرت کے اسباب پیدا ہوئے ہیں تو ان میں غرق ہو جایئے اپنے لئے نہ سہی کسی اور کے لئے جسکی مسرتیں صرف آپ سے وابستہ ہیں۔ یہی ہے اصلی رندی اور یہی ہے اس کی وہ بلندیِ اخلاق جو آپ کو محراب و منبر میں نظر نہیں آسکتی۔

جہاں نگاہ ہو وہیں دل بھی ہونا چاہئے — دل جائے دیگر ست و نگہ جائے دیگر ست — ہمارے کیش میں حرام ہے۔ "بہ ہوش باش" مناسب ہے، لیکن صرف اس حد تک کہ "ساغر دست مگزاری"

یہاں تک تو خطاب تھا صرف آپ سے اور وہ بھی نصائح کی صورت میں، کیونکہ جانتا ہوں مرد مسلمان ہونے کے لحاظ سے آپ کو نصیحت ہی کی زیادہ ضرورت ہے۔ لیکن ایک نہایت مختصر سی بات ان سے بھی کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ مرد کے مقابلہ میں عورت کی تنہا فتح صرف اس فلسفہ میں پنہاں ہے کہ

عہد تو شکست و من ہمانم!

ضرورت ہے

رشتہ کی ایک معزز خاندان کی نا کتخدا لڑکی کے لئے جو امسال میٹرک کے امتحان میں شریک ہوئی ہو اور اپنے سلیقہ و تمیز، ذہانت و ذوق کے لحاظ سے بہترین رفیق زندگی بننے کی اہل ہو صرف وہ اصحاب خط و کتابت کریں جو خود اپنی کوئی معقول ذاتی آمدنی رکھتے ہوں۔

ا - ح - ذریعہ منیجر نگار لکھنؤ

مکتوبات نیاز

آرام جان۔۔

تمھیں شرم آنی چاہئے کہ تمھاری طرف سے اتنی تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد بھی میں تمھیں "آرام جاں" کہتا ہوں۔ اگر میں تمھیں اصل راز سے آگاہ کردوں تو تم خفا تو خیر کیا ہوگے لیکن خفگی کا اظہار ضرور کروگے اور یہ مجھے پسند نہیں کہ جس نے ہمیشہ ہنس ہنس کر مجھے اذیت پہونچائی ہے وہ اب "چین پیشانی" کے ساتھ خنجر آزما ہو۔۔

آج تمھارا وہ خط جو تم نے یعقوب صاحب کو لکھا ہے اتفاق سے دیکھنے کو لگیا ـــ ماشاء اللہ، کیا کیا گل افشانیاں کی ہیں، کیا کیا "برشِ تیغِ جفا" پر ناز فرمایا ہے۔ کیوں نہ ہو، شاعر ہو، خوبصورت ہو، نوجوان ہو۔ اور رائنی اس قوت سے واقف کہ

کرشمہ کن دیک شہر را خراب انداز

اچھا تو سنو، میں نے بھی ایک فیصلہ کیا ہے اور وہ یہ کہ تمھیں کسی نہ کسی طرح یہ یقین دلا دوں کہ جو کچھ تم چاہتے ہو وہ پورا ہوگیا۔

کل شام کو ایسی سخت آندھی آئی کہ میرے مکان کی چھتیں گر پڑیں، در و دیوار سرنگوں ہوگئے، اس کے بعد دفعتاً ایک گوشہ سے شعلہ بلند ہوا اور میری ایک ایک چیز کو خاکستر کر گیا، میں گھر سے باہر نکل کر بھاگا تو لوگوں نے پتھر مارنا شروع کئے، میں گھبرا کر ایک کنوئیں میں کود پڑا اور وہیں ختم ہوگیا ـــ تمھیں خوش کرنے کے لئے اس سے زیادہ میرے امکان میں نہ تھا۔

بولو اب کیا کہتے ہو۔ کہو گے کیا۔ اور کہو گے بھی تو سنو گے کیا؟ میں تمھارا کشتہ ٹھہرا اور

برنیاید زکشتگان آواز

کا حال تم کو معلوم ہی ہے ـــ یہ آخری اور بالکل آخری خوشخبری ہے جو میں تمھیں سنا رہا ہوں۔ میں مر چکا ہوں اور احساس بعد الموت کا قایل نہیں ہوں اس لئے جو چاہو کہو۔ جو چاہو کرو۔ میری طرف سے اب کسی شکایت کا اندیشہ ہی نہیں ـــ

خدا حافظ

بندہ نواز - کرمنامہ ملا، الطاف وعنایات کا شکریہ ادا کرنا فرض ہے، لیکن اس فرض سے عہدہ برآ ہونے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ یہ آپ ہی بتائیے۔

اول تو احسان کے عوض میں احسان کرنے کا خیال ہی سرے سے ایک نامعقول بات ہے لیکن اگر میں اس نامعقولیت پر راضی ہو جاؤں تو بھی بیدست و پائی اور بے برگ و باری کا کیا علاج جس نے سوائے "شرمندۂ احسان" رہنے کے مجھے اور کسی کام کا رکھا ہی نہیں۔

میں جانتا ہوں کہ آپ کی فطرت اس سے بہت بلند ہے کہ آپ کسی کو ممنون بنائیں اور اس کے اعتراف کی بھی خواہش رکھیں۔ لیکن میں اپنی فطرت کے انحطاط کو کیا کروں جو خواہ مخواہ اُس بات پر مجبور کرتی ہے جسپر آپ راضی نہیں — بہرحال سوائے خاموش دعاؤں کے میں اور کر بھی کیا سکتا ہوں۔ جب تک زندہ ہوں دعاگو ہوں اور اس احساس کے ساتھ کہ یہ سب لغو و بیکار ہے۔

آپ کا یہ احسان صرف ایک قریشی صاحب پر نہیں ہے، بلکہ ان کی بیوی بچوں پر ہے، ماں بہن پر ہے اور اسی کے ساتھ مجھ پر بھی کہ میں ان کی پُرتکلیف زندگی کی کوفت سے آزاد ہو گیا۔ کل وہ غریب ملے تھے اس حال میں کہ آپ کا ذکر زبان پر تھا اور آنکھیں اشکوں سے لبریز تھیں۔ ان میں تو اتنی بھی جرأت نہیں کہ آپ کے سامنے اعتراف کرم کی کوئی ناکام کوشش بھی کر سکیں۔ آپ نے تو ان سے ہمیشہ کے لئے توت گویائی چھین لی ہے۔ میں یہ خدمت ان کی اور اپنی طرف سے انجام دے رہا ہوں لیکن جانتا ہوں جو حقیقت اسکی ہے۔ خوش رہئے اور کیا کہوں۔

خراموشکار من۔

عرفی کا شعر ہے:-

مرا فریب دہد نالہ و بہ غم گوید
ز من تراند شنو با اثر چہ کار مرا

آپ کو معلوم ہے کہ محبت کی کس منزل کی طرف اس میں اشارہ ہے؟ یاس و نا اُمیدی کی وہ آخری حد جب محبت کرنے والا اپنے آپ کو فریب دینا چاہتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ میں فریب دے رہا ہوں۔ لیکن ایک منزل اس سے آگے اور بھی ہے جب اس احساس کے بعد یک لخت خاموشی شروع ہو جاتی ہے۔ سو میں آپ کو آگاہ کر دینا چاہتا ہوں کہ اس تحریر کے بعد ہی میں اس منزل میں قدم رکھنے والا ہوں "من و تو" کا جھگڑا انتہائے قُرب نہیں بلکہ انتہائے بعد و ہجراں کی صورت میں ہمیشہ کے لئے مٹ جاتا ہے۔

آپ ایک امر کا عزم فرماتے ہیں، میں اسے پسند نہیں کرتا، اس کے بعد آپ کا اصرار شروع ہوتا ہے اور میں صرف اس لئے کہ آپ کی دلآزاری نہ ہو، کہدیتا ہوں ـــــ "خیر آپ کی مرضی"۔ ۲ دو مہینے اس طرح کی بات ہے۔ اس کے بعد میں اشارتاً و کنایتاً یاد دہانی کرتا ہوں۔ کوئی جواب نہیں ملتا، صراحتاً تقاضہ کرتا ہوں، آپ خاموش رہتے ہیں، طعن و تشنیع پر اتر آتا ہوں، آپ ٹال جاتے ہیں۔ یہ آخر کیا وضع ہے؟ کم از کم آپ نے یہ تو فرمایا ہوتا کہ آپکے وعدہ پر اعتماد کرکے ایک شخص ہر طرف سے کٹ کے آپ ہی کا ہو رہا ہے، پھر اس سکوت کے کیا معنی؟ میں تو اس قدر مجبوب ہوں کہ جسوقت وہ آتے ہیں تو ملنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی اور آپ کی "بے جگری" کا یہ عالم کہ خط کا جواب تک دینا گوارا نہیں۔ بہرحال میں تو مایوس ہو ہی چکا ہوں، وہ بھی ہفتہ عشرہ میں صبر کرکے بیٹھ رہیں گے۔ لیکن یہ سوچتا ہوں کہ اگر اس دنیا میں کبھی آپ سے ملاقات ہوئی (جس کی بظاہر کوئی امید نہیں ہے) تو آپ سے نہیں بلکہ میں کیونکر آپ سے آنکھیں چار کرسکوں گا۔

مجموعۂ استفسار و جواب ہر دو جلد

یوں سمجھئے کہ دائرۃ المعارف کی جلدیں ہیں جن کے ... اصفحات میں علم و ادب تاریخ و مذہب، نقد و تبصرہ اور عام معلومات کا ایک بے بہا خزینہ پوشیدہ ہے ان میں تقریباً .. ہم مسایل پر آپ کو وہ مواد ملے گا جو برسوں کی کتب بینی کے بعد بھی حاصل نہیں ہو سکتا، چند مباحث کی فہرست ملاحظہ ہو۔

مسئلۂ جبر و اختیار۔ خواب کی حقیقت۔ معاد و خلود۔ طبقۂ نسواں اور غزلگوئی۔ برج بابل۔ فاسسٹ جماعت سامری کون تھا۔ باغ ارم کی حقیقت۔ فلسفۂ محبت۔ بھوت پریت۔ اصحاب کہف۔ سالویشن آرمی۔ ہالہ کا سبب۔ معجزہ و کرامات۔ فرقۂ معتزلہ۔ مذہب و عقل۔ طوفان نوح۔ یاجوج و ماجوج۔ برہمو سماج۔ طبقۂ نسواں اور تعلیم۔ مریخ کی حقیقت۔ منصور حلاج۔ چند الفاظ کی تحقیق۔ اصطلاحات تصوف کا ترجمہ وغیرہ وغیرہ

قیمت ہر دو جلد معہ محصول خریداران نگار سے ۱۱ لیہ۔ غیر خریداران سے ۱۲

منیجر۔ نگار۔ لکھنؤ

تخیل کی جادوگری

جب نگاہیں پی کے اُٹھتی ہیں تخیل کی شراب
دیکھتی ہے آنکھ پراسرار نظاروں کے خواب
کشت جاں پر شبنم وجدان کی گرتی ہے پھوار
تیز ہو جاتی ہے محسوسات کی باریک دھار
شاہد فطرت اُلٹ دیتی ہے چہرے سے نقاب
ٹوٹتا ہے عقل کی محدود نظروں کا حجاب
غفلتوں کے خواب سے بیدار ہو جاتا ہے دل
زندگی کی لہر سے سرشار ہو جاتا ہے دل
زیر لب کچھ گنگناتی ہے گلستاں کی ہوا
گونجتی ہے ان سنے نغموں کی کانوں میں صدا

بخشتی ہیں سوز میں ڈوبی ہوئی بینائیاں
زندگی کی سادگی کو حسن کی رعنائیاں

شوق کی آنکھوں میں لہراتا ہے جب حسنِ خیال
سادگی میں بھی نظر آتا ہے فردوسی جمال
دور ہو جاتی ہے دل سے بے حسی کی تیرگی
آنکھ کو ملتا ہے نظارے میں ذوقِ آگہی
طائرانہ جن مناظر سے گزر جاتے ہیں روز
وہ مناظر حسن سے عاری جنھیں پاتے ہیں رد
دلکشی کا بھول کر جن پر نہیں ہوتا گمان
اُن میں شاعر دیکھتا ہے حسن کی باریکیاں
روح کو بیدار کر دیتا ہے وجداں کا اثر
حسن کی گہرائیوں تک ڈوب جاتی ہے نظر

مسکراتی ہے نئے انداز سے بزمِ حیات
حسن نو سے جگمگا اُٹھتی ہے ساری کائنات

ذوقی - بی - اے

ضرورت ہے

رشتہ کی ایک ۱۸ سال کی نا تجربہ کار لڑکی کے لئے جو معزز خاندان کی نہایت قبول صورت تعلیم یافتہ، صحیح و توانا، سلیقہ مند، سلیم الطبع سینے پرونے اور کاڑھنے کی ماہر ہے۔ انگریزی نہیں جانتی۔ صرف وہ اصحاب خط و کتابت کریں جو برسرِ روزگار ہیں یا کوئی ذاتی معقول آمدنی رکھتے ہیں۔

ن - م - ذریعہ منیجر نگار لکھنؤ

خانہ بدوش

میں آج شہر کے باہر ہوں ہمکنارِ خوشی
نظر نواز ہے، اک خوشنما "دیارِ خوشی"

زمیں پہ خیموں میں بیٹھے ہوئے ہیں خانہ بدوش
ہوائے دشت کی آزادیوں سے ہم آغوش

نظر میں اپنی لئے سقفِ آسماں کا جلال
رگوں میں گرمیٔ خوں، دل میں شورشِ سمال

ہر ایک مردِ جواں ان میں ہند کا سہراب
بلند مرتبہ، رفعت میں آسماں کا جواب

خود اعتمادیاں ان کی، ہیں ان کا سرمایہ
ہے ان کے عزم پہ عز و وقار کا سایہ

نہ ان کو ناز ہے جلسوں میں خودستائی کا
نہ ان کو فخر ہے ملت کی رہنمائی کا

نہ ان کو پوجتے ہیں ناخدائے اخباری
نہ ان کی جیبوں پہ کرتی ہے قوم زرباری

نہ ان کو چاہئے جرعاتِ خونِ انسانی
نہ مفلسوں کی کمائی سے خوانِ ایوانی

بساطِ دہر پہ ان کا کمال، نامحدود
نظر میں وسعتِ ممکن، خیال نامحدود

دل ان کے قوم پرستی کو مانتے ہی نہیں
وطن کے بھوت کو یہ لوگ جانتے ہی نہیں

قیودِ مذہب و ملت یہ لوگ کیا جانیں
فرشتے ہیں یہ خوشی کے، یہ سوگ کیا جانیں

نہ ان میں شیخ و برہمن کی مکر و عیاری
نہ ان میں جذبۂ قومی کی پست خونخواری

نہ کانپور کو یہ آگ سے جلاتے ہیں
نہ ان کو شہروں کو ویراں بنانا آتا ہے

یہ خود ہی دشت کو آباد کرتے رہتے ہیں
نہ لکھنؤ کو قیامت نما بناتے ہیں

ازل سے لائے ہیں آزاد زندگی یہ لوگ
خوشی کا چشمہ ہیں، جوشِ خوشی میں بہتے ہیں

زمانہ بھر ہے انھیں کا وطن جہاں جائیں
یہ جانتے ہیں تعصب ہے ایک روحی روگ

فلک پہ دیکھتے ہیں یہ بہارِ جلوہ فگن
ملیگا ان کو خوشی کا چمن جہاں جائیں

گلوں سے ملتے ہیں یہ اپنی دلکشی کی عید
زمیں پہ دیکھتے ہیں اپنی زندگی کا چمن

یہ دیکھتے ہیں گھٹاؤں میں رقص کا اعجاز
خموش رات میں سنتے ہیں نغمۂ ناہید

فضا کی گود میں یہ رازدارِ فطرت ہیں
ہوا کی موجوں میں سنتے ہیں ساز کی آواز

وجود ان کا ہے اس کائنات سے بالا
خودیِ حسن ہیں، خودداریٔ محبت ہیں

حیات ان کی ہے رنجِ حیات سے بالا

شعاعِ دیر و حرم ہے نگاہ میں ان کی
حریمِ زیست میں عشرت نصیب ہیں یہ لوگ
ہے ان کے حصے میں جو چیز وہ دریغ و عظیم
حسین حوریں ہیں، ان کی حیات کی پریاں
لباس سادہ ہیں، ان کے ہے شان آرائش
سروں پہ ان کے ڈوپٹے نہ پاؤں میں پاپوش
خرد فروز تقدس نظر نظر میں لئے
کھڑی ہیں خیموں کے باہر شباب میں مدہوش
جمال ان کا، جوانی کی رات ان کی ہے
خوشی کی صبح، محبت کی شام ان کی ہے
حسین جلووں میں رقصاں ہے موجِ برقِ شباب
عروسِ زیست نے پہنا ہے حسن کا گہنا
یہ فرطِ عیش، یہ مستی، یہ حسن و رعنائی
فضا میں گونج رہی ہے نوائے بربط و چنگ
ہیں ان کے مرد بھی رقص و سرود میں مصروف
غرض کہ خانہ بدوشوں کی دلکشی نے آج
خوشی کے دور میں ہر انقلاب ہے دھوکا
مجھے یقینِ قیام بہار ہے اب تک
تغیرات کے امکاں مگر نمایاں ہیں
اٹھائے خیمے، قیامت بلائی جاتی ہے
ہر اک امید میں اک انقلاب پیہم ہے
یہ وقت روح پہ بجلی گرانے والا ہے

کہ میہماں ہے خدا، بارگاہ میں ان کی
خودی سے دور، خدا سے قریب ہیں یہ لوگ
ہے انکی نظروں میں روحانیات کی تنظیم
یہ مست ناز ہیں، اس کائنات کی پریاں
سروں پہ سرخ کھسائے ہیں جان آرائش
نہ ان کو خواہشِ منصب، نہ زینتوں کا ہوش
گناہ سوزیِ دل، حسنِ بے خبر میں ہے
نہ ان کا حسن مقید ہے اور نہ پردہ بدوش
شباب ان کا ہے، برقِ حیات ان کی ہے
ضیائیں ان کی ہیں، تاب و دوام ان کی ہے
ابل رہا ہے نگاہوں کے ساتھ کیفِ شراب
فروغِ ہستیِ خانہ بدوش کیا کہنا
یہ ان کی باتوں میں انداز نغمہ پیرائی
بسی ہے دامنِ صحرا میں بزم دامش و رنگ
ہے انکی تازگیِ زیست عیش میں ملفوف
دکھا دیا ہے نگاہوں کو عشرتوں کا سوراج
سمجھ رہا ہوں، خیال عذاب ہے دھوکا
فریبِ خود دہ مرا اعتبار ہے اب تک
یہاں سے کوچ کے میں دیکھتا ہوں سامان ہیں
مری نگاہ کی دنیا سلائی جاتی ہے
ہر ایک عشق میں رنگِ نمود شبنم ہے
یہ وقت آج گزر کر نہ آنے والا ہے

مری حیات کو بیدار کرنے والو! رکو
سکون و صبر کو دشوار کرنے والو! رکو

فطرت واسطی بی۔ اے

عشق

دیکھنا یہ کون اُٹھا کیف برساتا ہوا
برق کے مانند روشن، صورتِ مستی رواں
دوش پر کچھ تیر، دستِ مرمریں میں اک کماں
بڑھ گیا آگے شفق کی جنتِ گلرنگ سے
آگیا نگینی عالم کی بزمِ خاص تک
ڈالکر اپنی نگاہیں انجمن در انجمن
گرمیاں بنکر مسلط ہوگیا جذبات پر
کھوگیا صبح جوانی کے تبسم زار میں
لی کمان اور ہوگیا آمادہ تیر افگنی
آدمیت کو بناکر آشنائے درد و سوز

بربطِ مہتاب پر کچھ گیت سے گاتا ہوا
ہر نفس کو نکہتِ تازہ سے مہکاتا ہوا
کائناتِ حسن کی موجوں میں لہراتا ہوا
اپنے زعمِ تیر اندازی پہ اتراتا ہوا
شاہراہِ کہنۂ عالم کو ٹھکراتا ہوا
اور کچھ آگے بڑھا پھولوں سے کتراتا ہوا
ہستی و مستی کے ہنگاموں کو للچاتا ہوا
مسکراہٹ کا سنہرا نور چھلکاتا ہوا
سامنے آیا دلوں پر تیر برساتا ہوا
اپنے مرکز کی طرف جاتا ہے بل کھاتا ہوا

"عشق" کہتے ہیں اسے فطرت کا یہ انعام ہے
عرش سے تا فرش اس کی حکمرانی عام ہے

نبی احمد بریلوی

مجھے ضرورت ہے

ایک ایسے معاون کی جو "نگار" کی ترتیب و تحریر میں مجھے پوری مدد دیسکے۔ انگریزی و عربی سے بے تکلف ترجمہ کرنے کی اہلیت ضروری ہے اور اسی کے ساتھ ادب و انشاء کا ذوق۔ جو حضرات اس کے لئے آمادہ ہوں وہ مجھ سے خط و کتابت کریں۔

شباز فتحپوری
اڈیٹر نگار

طور

جسے زبانِ محبت میں "طور" کہتے ہیں
وہیں کسی کی محبت کا خواب دیکھا ہے

(۱)

جہاں سکون بھی ہنگامہ ساز ہوتا ہے
جہاں سرور میں سوز و گداز ہوتا ہے
جہاں نیاز ہم آغوشِ ناز ہوتا ہے
وہیں کسی کی محبت کا خواب دیکھا ہے

(۲)

جہاں فلک کی ہے رفعت، زمیں کی پستی میں
جہاں خدا کی عبادت ہے، بت پرستی میں
جہاں ہے زہد بھی مصروف، مے پرستی میں
وہیں کسی کی محبت کا خواب دیکھا ہے

(۳)

جہاں کے نور سے خورشید جگمگاتا ہے
جہاں کا رنگ ہر اک گلستاں پہ چھاتا ہے
جہاں کا حسن محبت کے گیت گاتا ہے
وہیں کسی کی محبت کا خواب دیکھا ہے

(۴)

جہاں تبسمِ رنگیں میں پھول ہنستے ہیں
جہاں تکلمِ شیریں میں راگ بستے ہیں
جہاں نگاہ سے انوارِ دل برستے ہیں
وہیں کسی کی محبت کا خواب دیکھا ہے

(۵)

جہاں بہشت کے آثار پائے جاتے ہیں
جہاں نگاہ سے جادو جگائے جاتے ہیں
جہاں چراغ محبت جلائے جاتے ہیں
وہیں کسی کی محبت کا خواب دیکھا ہے

(۶)

جہاں کی موت میں پوشیدہ زندگانی ہے
جہاں کی زیست میں معراجِ نوجوانی ہے
جہاں سکون بھی اقدام پر فشانی ہے
وہیں کسی کی محبت کا خواب دیکھا ہے

(۷)

جہاں کی خاک پہ مہر اور ماہ رہتے ہیں
جہاں کی ارض پہ دریائے قدس بہتے ہیں
جسے زبان محبت میں "طور" کہتے ہیں
وہیں کسی کی محبت کا خواب دیکھا ہے

صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش (عثمانیہ)

سرمہ — کاجل - چورن — منجن

اڈیٹر صاحب نگار نے خود ان دواؤں کا اطمینان کرکے اپنی رائے ان کے مفید ہونے پر اکتوبر کے ملاحظات میں ظاہر کی ہے — **کاجل** — آشوب چشمی ضعف بصارت کے لئے ازبس مفید ہے ایک ڈبیہ جو ایک شخص کے لئے سال بھر کو کافی ہے قیمت عہ — **سرمہ** — بیش بہا سرمہ چالیس دن میں طیار ہوتا اس میں ممیرہ نہیں بلکہ معمولی سرمہ ہے جس کو جڑی بوٹیوں کے عرق میں پیس کر تیار کیا جاتا ہے اس کے فوائد کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ جالاد ہند موتیا بند اور ضعف بصارت صرف ایک ماہ کے استعمال سے جاتا رہتا ہے اور بارہا آزمایا ہوا ہے۔ قیمت فی پڑیہ عہ علاوہ محصول **چورن** - یہ وہ اکسیر چیز ہے جسکا ہر گھر میں رہنا ضروری ہے۔ پیٹ کا درد، قبض، نفخ، ریاح کا پیدا ہونا، سوء ہضم دستوں کا آنا سب یک لخت اسکے استعمال سے جاتا رہتا ہے۔ کیسا ہی شدید درد پیٹ میں ہو ایک چٹکی کھا لینے سے جاتا رہتا ہے۔ قیمت فی ڈبہ آٹھ تولہ عہ علاوہ محصول — **منجن** - اس کی ادنیٰ خوبی یہ ہے کہ اس سے ملتے ہوئے دانت جم جاتے ہیں۔ قیمت فی ڈبہ آٹھ تولہ عہ علاوہ محصول

نوٹ :- سب چیزیں منگانے والے کو محصول ڈاک معاف — پتہ :- م بیگم ذریعہ رسالہ نگار لکھنؤ

شاعر

مرے تبسم تخئیل سے عبارت ہے
ضیائے نیرِ رخشاں فروغِ ماہِ تمام

مرے خیال کی جنبش پہ رقص کرتی ہے
ادائے خاص سے سلمائے گردشِ ایام

مری نگاہ میں ہے لفظ و نشر ہر ذرہ
مرے خیال میں کونین صنعتِ الہام

مرا پیام ہے روح القدس کی اک آواز
مرے ضمیر پہ ہوتی ہے بارشِ الہام

مرے نقوش ہیں آثارِ نیم ربانی
مرے کمال کو بخشی گئی حیاتِ دوام

بطرزِ مطرب بدست پھوٹتی کونپل
سنا رہی ہے مجھے نغمۂ درود و سلام

کبھی نگاہ میں موجوں کے نرم ہلکورے
کبھی خیال میں جذبِ توازنِ اجرام

کبھی وہ جوش کہ دشمن بھی آنکھ کا تارا
کبھی یہ حال کہ بیگانۂ ذوی الارحام

کبھی حیات کو ٹکرا دیا چٹانوں سے
کبھی حباب سے کمزور زندگی کا نظام

کبھی یقین کی زد میں رموزِ لوح و قلم
کبھی وہ شک کہ ہر اک چیز پیکرِ اوہام

کبھی خیال کی زینت حرم کی محرابیں
کبھی نگاہ شہیدِ تبسمِ اصنام

اک انقلاب مکمل کا پیش خیمہ ہے
مرے خیال و تصور کا مضمحل اقدام

وہ کیف بار ہے میرے خیال کی دنیا
جہاں تصور زہد و ورع گناہ و حرام

جہاں شراب کی موجوں پہ رقص کرتے ہیں
بہ حسن ناز و ادا شاہدانِ گل اندام

جہاں ذریعۂ عرفاں، وسیلۂ بخشش
گناہ نام ہے جس کا، اصطلاحِ عوام

جہاں ہے جنبشِ ساغر اشارۂ غیبی
جہاں ہے قلقلِ مینا ضمیر کا پیغام

جہاں کا مسلکِ عالی ہے رندی و مستی
جہاں کا ضابطہ اشعارِ حافظ و خیام

جہاں طواف کا مرکز ہے خشتِ میخانہ
جہاں ہے غرقِ مئے ناب جامۂ احرام

جہاں طرب کے فسانے سنائے جاتے ہیں
حدیثِ مطرب و ساغر جہاں کا علمِ کلام

جہاں کی خاک ہے اک رودِ آتشِ سیال
جہاں فضا میں برستا ہے بادۂ گلفام

جہاں شراب سے تطہیرِ روح ہوتی ہے — جہاں ہے پیرِ مغاں کی نوازش و اکرام
جہاں کی صبح پہ صدقے سحرِ بنارس کی — جہاں کی شام پہ قربان ہے اودھ کی شام

مرے خیالِ جہاں گیر کے ہیں چند نقوش — فسانۂ چہ بابل، قدامتِ اہرام[1]

وہ فلسفہ کہ جو تہذیبِ عقل کرتا ہے — مری نگاہ میں اک ہیئتِ جنونِ خام
لطیف تر ورقِ گل سے ہے مرا احساس — مرے لئے ہے تبسمِ کلی کا اک پیغام

مرے فسانۂ رنگیں کا ماحصل یہ ہے
کہ ہوں میں اہلِ محبت کا بندۂ بیدام

ماہر القادری

بلیک ڈائمنڈ

ہندوستان کا واحد بے ضرر خضاب

اس وقت بازار میں مختلف ناموں کے خضاب بکثرت نظر آتے ہیں لیکن یہ تمام خضاب ایک ہی چیز ڈایامین سے تیار ہوتے ہیں جو بے انتہا ارزاں چیز ہے لیکن اس کے استعمال کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند دن کے بعد چہرہ پر آماس آجاتا ہے، نزلہ کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے، جلد پر دانے پڑ کر زخم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور بعض مرتبہ جب اس کا زہر آہستہ آہستہ خون میں پوری طرح سرایت کر جاتا ہے، ہلاکتیں بھی ہو جاتی ہیں، کیونکہ ڈایامین میں نہایت ہی مہلک قسم کا زہر ہے اور صرف چمڑا رنگنے کے کام میں لایا جاتا ہے۔ ہمارا خضاب ڈایامین یا کسی زہریلی چیز سے بالکل پاک ہے اور اس کے استعمال سے کبھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ بالوں کو اصلی سیاہ رنگ دیکر اُن کی چمک اور مضبوطی بھی قایم رکھتا ہے اور جلد پر دھبے نہیں آنے دیتا۔ قیمت علاوہ محصول ایک ۹ر۔ ایک شیشی میں محصول ۶ر صرف ہو جاتا ہے، اس لئے جتنی زیادہ شیشیاں طلب کی جائینگی اتنا ہی فائدہ ہوگا ——— ہر شہر میں ایجنسیاں درکار ہیں ——— کمیشن کے متعلق خط و کتابت کیجئے۔

کارخانہ خضاب بلیک ڈائمنڈ لکھنؤ

---

[1] اہرام مصری

قطعات

چاندنی راتیں

ہمیشہ جاگتے ہی جاگتے سحر کردی!! کبھی ہنسا، کبھی آہیں بھریں، کبھی رویا
بنا کے چاند کو اپنا گواہ کہتا ہوں میں آج تک شبِ مہتاب میں نہیں سویا

شبِ بہار

گھٹائیں جھوم رہی ہیں، ہوائیں رقصاں ہیں فضا ہے مست، زمانہ اسیرِ غفلت ہے
ان آنسوؤں کی مرے دوست! وجہ کچھ بھی نہیں شبِ بہار میں رونے کی مجھ کو عادت ہے

خلش

کیا کہوں کیا ہے دل کی حالت آج بس یہ محسوس کر رہا ہوں میں
ننھے ننھے نکیلے کانٹوں کا ایک گچھا نگل گیا ہوں میں

شگفتگی

غم سے پُر ہے اگرچہ قلبِ حزیں کبھی ہوتا نہیں میں چیں بجبیں
اس طرح ہنس کے بات کرتا ہوں جیسے غم کو میں جانتا ہی نہیں

کیفِ برشگال

رات کا وقت ہو، گھٹائیں ہوں بھیگی بھیگی خنک فضائیں ہوں
چوٹ کھایا ہوا ہو دل اختر اور برسات کی ہوائیں ہوں

اختر انصاری بی، اے

غزل

مجھے حیرت نہیں ہے، آئینہ خانے کو حیرت ہے
کہ جلوہ پیدا کر لینا مری نظروں کی فطرت ہے

جہاں اک بار تو چمکا تھا برقِ زندگی بن کر
اسی پردہ سرائے دل میں پھر تیری ضرورت ہے

وہ کوئی ماورائے کفر و ایماں نذر تو مانگیں
ہمارے پاس بھی اک چیز ہے، اور وہ محبت ہے

نیازِ عشق رسمِ عام ہو کر رہ گیا آخر
انھیں اک سجدہ کرنے کی مجھے اب تک ندامت ہے

نظر آتا تو ہے اک عکس صورت خانۂ دل میں
مگر یہ کہہ نہیں سکتا کہ وہ تیری ہی صورت ہے

بقیدِ ہوش سازِ بیخودی دو دن سنا تو کیا؟
ذرا دیوانہ ہو جاؤں تو پھر فرصت ہی فرصت ہے

بسر ہو گی لحد میں حشر تک کیونکر خدا جانے
کہ مجھ کو تو تمھارے سامنے رہنے کی عادت ہے

فضل اثر - بی - اے - (آگرہ)

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اُسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔

قیمت علاوہ محصول عہ

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اُصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان اسکی تخیل اسکی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے

قیمت علاوہ محصول عہ

فراست الید

مؤلفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سرت عروج و زوال موت و حیات صحت و بیماری شہرت و نیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشینگوئی کر سکتا ہے

قیمت علاوہ محصول عہ

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اسکی نظیر نہیں مل سکتی۔

قیمت دس آنے علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے انکی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے اُردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بہترین نمونے نظر آتے ہیں

قیمت علاوہ محصول ۱۲

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں ۱۔ چند گھنٹے فلاسفہ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔

۲۔ مادیئن کا مذہب

۳۔ حرکت کے کرشمے

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے قیمت عہ علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہگئی ہیں۔

قیمت (۱۲ر) علاوہ محصول

تاریخ الدولتین

جرجی زیدان کی تاریخ تمدن اسلام کی چوتھی جلد کا ترجمہ جس میں عہد بنی اُمیہ و بنی عباس کی سیاسیات پر بے مثل تبصرہ کیا گیا ہے۔ جرجی زیدان کی یہ کتاب بیحد لاثانی شہرت حاصل کر چکی ہے

قیمت (۸ر) علاوہ محصول

گہوارۂ تمدن

وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جسمیں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدنی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیا کی تہذیب و شائستگی اسکی کس قدر ممنون ہے اُردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی مصنف کو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔ قیمت عہ علاوہ محصول۔

صحابیات

اسمیں عہد سعادت کی ۸۰ خواتین کے مستند حالات یکجا کر دیئے گئے ہیں اسکا مقدمہ جسے مؤلف کے خاص اپنی انشاء میں لکھا ہے دیکھنے کے قابل ہے موضوع پر اور کتابیں بھی مگر مصنفین کی موجود ہیں لیکن اتنی صحابیات کے حالات کسی کتاب میں درج نہیں کئے گئے ہیں۔ قیمت عہ ۸ر علاوہ محصول۔

المسئلۃ الشرقیہ

مصطفےٰ کامل پاشا کی اس مشہور عالم کتاب کا ترجمہ جسنے یورپ ایشیا کی سیاسیات میں ہلچل ڈالدی تھی اور جسنے سب سے پہلے ترکی و مصر عرب و حجاز میں انقلاب کی روح پھونک کر عالم اسلامی کے درخشاں مستقبل کو بے نقاب کر دیا تھا۔

قیمت عہ علاوہ محصول

عرض نغمہ

یعنی ٹیگور کی گیتانجلی کا سب سے پہلا اُردو ترجمہ جسکے متعلق ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کی رائے تھی کہ دنیا کی کسی زبان میں گیتانجلی کا ترجمہ اس سے بہتر نہیں کیا گیا اسکے شروع میں ایک نہایت ہی دلچسپ مقدمہ بھی شامل ہے قیمت غیر مجلد عہ علاوہ محصول

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

شاہی

تیار کردہ

طبی

دواخانہ

یونانی

شاہی

تیار کردہ

طبی

دواخانہ

یونانی

ملیریا اور ٹائیفائیڈ (موتی جھرہ)

کے بعد کمزوری دفع کرنے کیلئے

"شاہی"

لاجواب دوا ہے

ہسٹریا اور اسقاط حمل

کے

دفع کرنے میں

"شاہی"

کا مقابلہ کرے ایسی

دوا شاذ و نادر

ہی ہو

انیمیا (کمی خون) دمہ

کھانسی و جملہ امراض

سینہ کے لئے

"شاہی"

اکسیر علاج

ہے

مزید معلومات کے لئے

ہفت رنگین رسالہ مفت طلب کیجئے

طبی دواخانہ یونانی

اندور (مالوہ)

تار کا پتہ :- "شاہی" اندور

۶۶ محمد علی روڈ بمبئی نمبر ۳

ٹیلیفون نمبر ۲۶۹۸۳

مطبع: الحاج شاہ حسین نظر محمد پرنٹر